سوانح قاسمی

یعنی

سیرت شمس الاسلام

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ

حصہ دوم حصہ سوم

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ رحمانیہ
اقرا سنٹر غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور

جلد سوم

سوانح قاسمی

یعنی

سیرت شمس الاسلام

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہٗ

رئیس القلم حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ

ناشر

مکتبہ رحمانیہ ۞ اردو بازار ۞ لاہور

"نزہت رقم" تھا۔ ہندوستانی مطابع میں خط نسخ (عربی) کی کتابت کرنے والوں کا بتا چکا ہوں کہ زیادہ تر ان ہی منشی ممتاز علی اور ان کے بیٹوں منشی مشتاق علی و عبدالغنی مرحومین پر سلسلہ تلمذ منتہی ہوتا ہے۔

دلی کا مشہور مطبع مجتبائی، اس کے بانی یہی منشی ممتاز علی مرحوم تھے، ان ہی سے مولوی عبدالاحد نے اس مطبع کو خریدا، اور اسی کی بدولت دلی کے رؤسا اعظم میں گنے گئے۔ مصنف امام ہی کے حوالہ سے کہیں نقل کر چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی اور سیدنا الامام الکبیر کے درمیان "پرانی دوستی" تھی۔ میرٹھ میں منشی صاحب ہی نے آپ کو بلا کر رکھ لیا تھا۔ قرینہ کا اقتضا ہے کہ منجملہ دوسرے رفیقوں کے منشی جی بھی حج کے اس دوسرے سفر میں آپ کے رفیق ہی نہ تھے۔ بلکہ تعجب نہیں کہ زاد راحلہ کی پیش کش بھی ان ہی کی طرف سے ہوئی ہو، چونکہ اس وقت تک یعنی ۱۲۸۷ھ تک دخانی جہاز سے حج کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے قیاساً یہی سمجھنا چاہیے کہ پانچ چھ مہینہ سے زیادہ آمد و رفت میں صرف نہ ہوا ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب

چاہئے تو یہی تھا کہ مصنف امام جیسے بزرگوں نے اس دوسرے حج کے ذکر میں جب حد سے زیادہ اجمال سے کام لیا تو ہم بھی اس سے زیادہ اس کے متعلق اور کچھ نہ لکھتے، لیکن خوش قسمتی سے سیدنا الامام الکبیر ہی کی کتاب "آب حیات" کے دیباچہ میں بعض دل چسپ اور دل آویز باتیں اسی دوسرے حج کے متعلق پائی جاتی ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ آخری حج کے تذکرہ کے ساتھ "آب حیات" کی ان باتوں کا بقدر ضرورت یہاں ذکر کر دیا جائے۔

آپ کی یہ کتاب "آب حیات" جو شاید حضرت والا کی تمام تصنیفات میں سب سے زیادہ مشکل کتاب ہے، اس میں بقول آپ کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ

> "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنوز قبر میں زندہ ہیں، اور مثل گوشہ نشینوں اور چلہ کشوں کے عزلت گزین ہیں۔"

کتاب و سنت کے بینات کو عقلی استدلال کے رنگ میں پیش کرنے کی یہ ایک ایسی کوشش ہے کہ

آدمی کتاب کو پڑھتا جاتا ہے، اور ایسے نتائج ان ہی بینات سے نکالے ہوئے اس کے سامنے آتے جاتے ہیں، جن کی طرف خیال بھی نہیں گذرتا تھا کہ ان ہی سے وہ پیدا ہو سکتے ہیں۔ کتاب کے مضامین کی قدر و قیمت مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتی ہے، اگرچہ اس کے مطالعہ کے لئے کمال استعداد کے ساتھ کافی صبر و استقامت کی ضرورت ہے، اس وقت صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ درحقیقت سیدنا الامام الکبیر کی ایک قدیم تصنیف "ہدیۃ الشیعہ" جو رفض کی تردید میں لکھی گئی ہے، اسی کتاب ہدیۃ الشیعہ کا "آب حیات" دراصل تتمہ یا تکملہ ہے، باغ فدک وغیرہ کی وراثت کے قصوں میں یہ سوال جو پیدا ہوتا ہے، کہ وارثوں میں ترکہ کی تقسیم کا مسئلہ تو مورث کی وفات اور موت کے بعد پیدا ہوتا ہے، لیکن مورث کی زندگی میں وراثت کی فکر میں الجھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اسی سلسلہ میں اہل سنت والجماعت کا جو یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بجسدہ اپنے روضہ پاک میں زندہ ہیں، اسی کو بنیاد بنا کر سیدنا الامام الکبیر نے گویا سمجھنا چاہئے، کہ حیات و موت اور اس کے ظہور کی مختلف شکلوں کے متعلق ایک مستقل نظام ہی کو مرتب کر کے پیش کیا ہے۔

آب حیات کے دیباچہ میں ان ہی باتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے، کہ

"۱۲۸۶ھ ہجری میں قبل رمضان شریف سراپا کرم و عنایات مہتمم مطبع ضیائی واقع میرٹھ منشی محمد حیات نے تحریر مذکور مسمی بہ ہدیۃ الشیعہ کو چھاپنے کا ارادہ کیا اور اس کی تصحیح میرے ذمہ ڈالی"۔ ص۳

اس کے بعد آپ نے ارقام فرمایا ہے کہ تصحیح کے موقعہ پر خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجسدہ زندگی کا جو دعویٰ ہدیۃ الشیعہ میں کیا گیا تھا، استدلالی طور پر جیسی کہ چاہئے اس پر بحث نہ ہو سکی تھی پس مناسب معلوم ہوا کہ

"اول اس دعوے کو موجہ کیا جائے۔ دوسرے اعتراض تعارض آیت کریمہ انک میت اور علیٰ ہذا القیاس اعتراض تعارض بعض احادیث کا جواب دیا جائے"۔

جس سے دوسرے سفرِ حج کے موقعہ پر بمبئی کے قیام کی مدت کا بھی پتہ چلتا ہے، اور اس کا بھی، کہ بمبئی پہنچنے کے بعد طبیعت بھی کچھ حضرت کی ناساز ہوگئی تھی۔ لیکن بااین ہمہ سفر کے اسی حال میں آپ نے ہدیۃ الشیعہ کے اس ضمیمہ کو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجسدہ زندہ رہنے کو ثابت کیا گیا تھا، پورا کیا۔ چاہئے تو یہی تھا کہ بمبئی ہی سے اس کو میرٹھ منشی محمد حیات کے پاس بھیج دیتے، لیکن ایسا نہ ہوا، کیوں نہ ہوا؟ اسی کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے، کان والوں کو چاہئے کہ اس کو سنیں، اور جو آنکھیں رکھتے ہیں، ان ہی کو میں دکھانا چاہتا ہوں۔

مکہ معظمہ میں جیسا کہ معلوم ہے حضرت والا کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے ہجرت کر کے مقیم ہو چکے تھے، اور خود گیا مقیم ہوئے تھے۔ اسی دیباچہ میں سیدنا الامام الکبیر نے براہِ راست اپنی یہ شہادت قلم بند کی ہے، یعنی حاجی صاحب قبلہ کا ذکر کر کے لکھا ہے، کہ

"ہنگامہ رستخیز، غدر[1] ہندوستان کے بعد وطن قدیمی تھانہ بھون ضلع سہارنپور و مظفر نگر کو چھوڑ کر بحکم اشاراتِ باطنی بلد اللہ الامین مکہ معظمہ زادہا اللہ شرفاً و عزاً تا میں مقیم ہیں"۔ صـ۲

آپ دیکھ رہے ہیں۔ حضرت والا کے ذمہ دار قلم سے "بحکم اشاراتِ باطنی" کے الفاظ جو اس موقعہ پر درج ہوئے ہیں، یقیناً یہ صرف الفاظ نہیں ہیں۔

بہر حال اس وقت تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہدیۃ الشیعہ کا یہ ضمیمہ اگرچہ بمبئی ہی میں لکھا جا چکا تھا،

---

[1] آپ کی اس عبارت میں ۱۸۵۷ء کے فتنہ کی تعبیر "غدر" کے لفظ سے کی گئی ہے۔ ممکن ہے عام شہرت کی وجہ سے یہی لفظ قلم پر آگیا ہو۔ علاوہ اس کے ۱۸۵۷ء میں غدر یعنی عہد شکنی تو ہوئی تھی۔ لیکن ابتداء عہد شکنی کی حکومت کی طرف سے ہوئی تھی، یا رعایا کی طرف سے؟ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس لئے غدر کے لفظ پر لوگوں کو تعجب نہ ہونا چاہئے۔ دوسرا لطیفہ تھانہ بھون کے ضلع کے مستقر کے متعلق سہارنپور اور مظفر نگر دونوں ہی کے نام درج کر دیئے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ تھانہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے دونوں ہی شہروں سے تعلق رکھتا ہے۔ اور دونوں ہی کی طرف منسوب ہو سکتا ہے ۱۲

"اوراق مسودہ کا پشتارہ باندھ کر جہاز پر چڑھا"

جہاز پر کن احساسات کے ساتھ سوار ہوئے، اور جدہ پہنچے، پڑھئے اور سر دھنئے ارقام فرمایا گیا ہے

"اور محض بامداد خداوندی، باوجود گمراہی اور نامہ سیاہی کے جس کی وجہ سے اپنی رسائی تو در کنار ہمراہیوں کی گم گشتگی کا بھی اندیشہ تھا دریا پار ہو کر جدہ پہنچا" ص۱۲

یہ ہے، عبدیت اور بندگی کی وہ شان، کہ سب کچھ مل رہا ہے، لیکن بندے کی نظر اپنی بندگی سے ایک لمحہ کے لئے نہیں ہٹتی، جدہ پہنچنے کے بعد آگے بیت اللہ الحرام کی طرف روانگی کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ ارقام فرمایا گیا ہے، وہ بھی سننے کے قابل ہے، ارشاد ہوا ہے۔

"اور وہاں سے (یعنی بندرگاہ جدہ سے) بسواری شتر دو روز میں دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا"

حالانکہ مکہ معظمہ میں ایک ہی قبلہ ہے، لیکن بجائے اس ایک قبلہ کے آپ دیکھ رہے ہیں حلقہ دیوبند کے سیدنا الامام الکبیر فرماتے ہیں

"دو قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا"

پہلے قبلہ کی تشریح ان الفاظ میں فرمانے کے بعد یعنی

"بیت اللہ زادھا اللہ شرفا وعزۃ الی یوم القیمۃ کا طواف میسر آیا"

اسی مکہ معظمہ بلد اللہ الامین میں اپنے دوسرے قبلہ[1] کی نشاندہی جن الفاظ میں فرمائی گئی ہے

---

[1] مسلمانوں میں "قبلہ وکعبہ" کے الفاظ یوں تو بزرگوں والدین وغیرہ کے متعلق عام طور پر مستعمل ہیں۔ بظاہر سلسلہ کی طرف سے جہاں تک میں جانتا ہوں اس پر دارو گیر عموماً نہیں کی گئی۔ یوں بھی جس کی طرف رخ کیا جائے حقیقتاً اس کو قبلہ کہتے ہیں۔ پھر حق سبحانہ وتعالیٰ کو اپنا مطلوب و مقصود بنا کر عموماً شیخ طریقت کی طرف رخ کیا جاتا ہے، جیسے کعبہ کی طرف بھی رخ حق تعالیٰ ہی کی عبادت کے لئے آدمی کرتا ہے وجہ تشبیہ ظاہر ہے، نیز صحاح کی اس حدیث کی رو سے جس میں ہے کہ کعبہ کی طرف ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (باقی اگلے صفحہ پر)

میں ان کو نقل کرنا چاہتا ہوں، لیکن حیران ہوں کہ ان مسکینوں، دین اور عقل کے مسکینوں کی شکم پروری کا ذریعہ کیا باقی رہے گا۔ جو کوچہ و بازار میں اکابر دیوبند پر توہب کی تہمت تراشیوں سے ناواقف مسلمانوں کی جیبیں تراش رہے ہیں۔

اور بیداری کا پیغام ان چھوٹوں کے لئے بھی ہے، جن کے چھوٹے حوصلوں، اور تنگ سینوں میں اپنے بڑوں کے احترام و عقیدت کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے، وہی جو کچھ نہ ہوتے کے باوجود اپنے آپ کو سب کچھ باور کئے بیٹھے ہیں، لیکن دیکھئے اس پوری کتاب میں جس کی بڑائیوں کا نظارہ مسلسل آپ کے سامنے گذرتا رہا ہے، اپنے بڑوں کے آگے وہ کتنا چھوٹا بنجاتا تھا، سنئے، دوسرا قبلہ جس کی زیارت سے شرف اندوز ہونے کا موقعہ مکہ معظمہ پہنچ کر میسر آیا، ان ہی کے الفاظ میں سنئے، فرماتے ہیں۔

یعنی بزیارت مطلع انوار سبحانی، منبع اسرار صمدانی، مورد افضال ذی الجلال والاکرام، مخدوم و مطاع خاص و عام، سر حلقۂ مخلصان، سراپا اخلاص، سر لشکر صدیقان با اختصاص، رونق شریعت، زیب طریقت، ذریعۂ نجات، وسیلہ سعادات، دستاویز مغفرت نیاز مندان، بہانۂ واگذاشت مستمندان، ہادی گمراہان، مقتدائے دین پناہان، زبدہ زمان، عمدۂ دوران سیدنا و مرشدنا

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) اشارہ کر کے فرمایا کہ خدا کے نزدیک تو سب سے زیادہ محترم ہے، لیکن ایک مؤمن کا احترام تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ اس حدیث کی بنیاد پر بھی سیدنا الامام الکبیر کی تعبیر میں خلجان کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، کرامات امدادیہ میں حضرت تھانوی نے نقل کیا ہے کہ مکہ معظمہ کے شریف کا کوئی مصاحب تھا جو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے دل میں کچھ کدورت رکھتا تھا۔ لوگوں کو خیال تھا کہ نامی کر کے نقصان نہ پہنچائے۔ ایک دن وہی حاجی صاحب کی مجلس مبارک میں حاضر ہوا تو اس سے کہنے لگے کہ خدا کے سوا کسی مخلوق سے میں نہیں ڈرتا" اور فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ مکہ معظمہ سے مجھے کوئی جلاوطن کر سکتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ جہاں بیٹھ جاؤں گا میرا وہی مکہ اور وہی مدینہ ہے" اسکے بعد کعبہ کی حقیقت بیان کر کے یہ بھی ارشاد ہوا کہ عبدالحق جامع ہیں وہ حقیقت کے ساتھ صورت کی بھی رعایت کرتے ہیں اور بظاہر مکہ معظمہ کو بھی نہیں چھوڑتے "شمذا حضرت تھانوی رحمۃ اسی کے ذیل میں لکھا ہے کہ کوئی شخص مکہ و مدینہ میں رہے لیکن اصلاح باطن نہ کرے تو اس کا وہاں رہنا ہیچ ہے ۱۲

مولانا الحاج امداد اللہ لازال کاسمہ امداداً من اللہ للمسلمین واہل اللہ "

دیکھا آپ نے؟ دوسرا قبلہ مکہ معظمہ میں آپ کا کون تھا، اپنے بزرگوں کے احترام وعقیدت کا اس سے زیادہ بہتر نمونہ اور کیا پیش کیا جاسکتا ہے۔

بہرحال مکہ معظمہ پہنچنے کے بعد اپنے پیر و مرشد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہدیۃ الشیعہ " کا وہ ضمیمہ سنایا گیا، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بجسدہ زندہ رہنے کے دعوے کو مدلل کیا گیا تھا، یہ ارقام فرمانے کے بعد

"جب زبان فیض ترجمان (حاجی صاحب) سے آفرین و تحسین سن لی، تو اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک محقق ہو گئی " ص۵

آگے حضرت حاجی صاحب کے اس حکم اور مشورہ کو نقل کیا گیا ہے کہ

"تقریر اثبات حیات، سید الموجودات، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدیۃ الشیعہ سے جدا کر کے جدا نام رکھ دیجئے "

اسی حکم کی تعمیل میں ارادہ کیا گیا کہ مستقل کتاب کی شکل میں اس خاص مسئلہ کے مباحث کو مرتب کر دیا جائے، اور حج کے اسی سفر میں جیسا کہ ارقام فرمایا گیا ہے کہ

"دل میں یہ ٹھان کر قلم اٹھایا، اور تحریر ائی کر شروع تو خدا کے گھر سے کیجئے اور بن پڑے تو بوسہ گاہ عالم، در سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اختتام کو پہنچائیے تاکہ ابتداء اور انتہا دونوں مبارک ہوں، ورنہ جس قدر بن پڑے، غنیمت ہے۔ کیونکہ اس وسیلے سے اس ظلوم وجہول کو امید صحت نظر حسن قبول ہے " ص۶

متوسط تقطیع پر حضرت والا کی یہ کتاب " آب حیات " (۲۵۸) صفحات پر ختم ہوئی ہے، نہیں کہا جاسکتا کہ کتاب کی ابتداء اور انتہا کے متعلق یہ ارادہ جو طے کیا گیا تھا، کام اسی ارادہ کے مطابق پورا ہوا یا نہیں، امید تو یہی ہے کہ " خدا کے گھر " میں جو نیت کی گئی تھی، خدا نے آپ کی اس نیت کو نبھا ہی دیا ہوگا، آخری فقرے جس پر کتاب کا یہ دیباچہ ختم ہوا ہے وہ یہ ہیں

قید تحریر ہی میں نہیں، بلکہ چھپ چھپا کر مدت ہوئی عام طور پر شائع و ذائع بھی ہو چکا ہے، تو اسے میں کیوں چھپاؤں، اللہ اللہ آج سے تقریباً آٹھ سال پہلے اپنے دوسرے حج کے موقعہ پر بجائے ایک قبلہ کے مکہ معظمہ میں دوسرے قبلہ کو جو ڈھونڈھ رہا تھا، اور پانے کے بعد خدا کا شکر ان الفاظ میں ادا کرتا ہی کہ مکہ ہی میں

"دونوں قبلوں کی زیارت سے مشرف ہوا"

کیسی عجیب بات ہے کہ اس تیسرے حج میں دکھا گیا، اپنے ڈھونڈھنے والے کو وہی تلاش کر رہا ہی جو دوسرے حج کے موقعہ پر اس کا دوسرا قبلہ بنا ہوا تھا صاف لفظوں میں سنئے حضرت تھانویؒ کی ایک مشہور کتاب "کرامات امدادیہ" بھی ہے، اسی میں انہوں نے الہ آباد کے مشہور عالم و صوفی مولانا محمد حسین الہ آبادی جنکی وفات ہی بحالت وجد و حال اجمیر شریف میں ہوئی، ان ہی کے حوالہ سے یہ روایت درج کی ہے کہ مولانا الہ آبادی کے ایک دوست مولوی افضال الحق نامی تھے، لکھا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے غلاموں میں تھے۔ یہی مولوی افضال الحق بیان کرتے تھے کہ مکہ معظمہ میں

"جن دنوں میں حضرت حاجی صاؒ کی خدمت میں حاضر تھا"

یہی زمانہ تھا، جس میں اس تیسرے وداعی حج کیلئے لیجانیوالے سیدنا الامام الکبیر کو اپنے ساتھ لئے ہوئے حجاز کا سفر کر رہے تھے، مولوی افضال الحق صاحب کا بیان ہے کہ اسی عرصہ میں ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ

"اشراق کی نماز کے بعد مراقبے سے آپ نے (یعنی حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے) سر اٹھایا اور فرمایا"

جو کچھ ارشاد فرمایا، اسے سنئے، خود حاجی صاحب مکہ معظمہ میں ہیں، اور ارشاد فرما رہے ہیں کہ

"عجب نہیں کل مولوی محمد قاسم وغیرہ یہاں آجائیں"

جیسا کہ آئندہ معلوم ہوگا، حجاج کا یہ ہندی قافلہ تقریباً ایک سو سے زائد علماء پر مشتمل تھا، خود حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس میں شریک بلکہ گویا امیر قافلہ تھے۔ لیکن بجز اس کے جسے لانیوالے اپنے ساتھ لئے آ رہے تھے، آنیوالوں میں سے نام کسی کا نہیں لیا جا رہا ہے، صرف "وغیرہ" کے لفظ سے ان کی طرف اشارہ اس موقعہ پر کافی سمجھا گیا، اور بات اسی پر ختم نہیں ہو گئی، مولوی افضال الحق صاحب حضرت حاجی صاحب سے اس خبر کو سنکر جیسا کہ چاہیے تھا عرض کیا کہ

"کیا کوئی خط آیا ہے؟"

"خوب نماز پڑھی ، بھئی خوب نماز پڑھی"

لیکن خود حضرت گنگوہی ، اور آپ کے ساتھ نمازیوں کی کافی تعداد سیٹی کی آواز سے قطعاً بے پرواہو کر نماز ہی میں مشغول رہے، حضرت گنگوہی کے بھانجے مولوی عزیز الرحمٰن جوان نمازیوں میں شریک تھے ، وہی مولوی عاشق الٰہی سے کہتے تھے کہ

"ادھر نماز ہورہی تھی ، اور ادھر ریل چیخ رہی تھی ، مگر ایک قدم آگے کو سرک نہیں سکتی تھی"

وہی یہ بھی کہتے تھے کہ

"۱۷ منٹ کا وقفہ ہوا"

یعنی مقررہ وقت گاڑی کا جو تھا ، اس پر سترہ منٹ گذر گئے ، انجن آگے نہیں بڑھ رہا تھا، آخر باطمینان تمام سلام پھیر کر جب سارے نمازی گاڑی میں سوار ہو گئے ، تب چیخنے والا انجن بھی متحرک ہوگیا۔

خدا ہی جانتا ہے ، کہ اس سلسلہ میں دیکھنے والوں نے اور کیا دیکھا ، ان کو کیا کیا دکھایا گیا ، البتہ سیدنا الامام الکبیر کی حد تک یہ کہہ سکتا ہوں ، کہ حاجیوں کی یہی "اسپیشل ٹرین" جب بمبئی پہنچی ، تو اسٹیشنوں پر پہنچ پہنچ کر پیش کرنے والے حضرت والا کی خدمت میں جو کچھ پیش کر رہے تھے ، جن صاحب کے پاس یہ رقمیں جمع ہو رہی تھیں ، انہوں نے حساب کر کے حضرت والا کو اس کی میزان سے جب آگاہ کیا ، تو مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب کی زبانی فقیر نے سنا ہے ، کہ میزان سے مطلع ہونے کے بعد آپ نے حکم دیا کہ فلاں فلاں صاحب کو تار دے دیا جائے کہ حج کا ارادہ ہو تو میرے پاس بمبئی پہنچ جائیں۔ تعداد تو مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے نہیں بتائی تھی ، لیکن کافی لوگ تھے ، جن کے نام تار روانہ کئے گئے ، ایک غیر مترقبہ نعمت تھی ، لوگ تار پانے کے ساتھ ہی چل پڑنے پر آمادہ ہو گئے اور آگے پیچھے بمبئی پہنچتے چلے گئے۔ ان ہی بلائے ہوئے حضرات کی وجہ سے ایک قصہ

بھی پیش آیا، جس کا ذکر مولوی عاشق الٰہی صاحب نے تذکرۃ الرشید میں بھی کیا ہے۔
مطلب یہ ہے، عرض کر چکا ہوں کہ سہارنپور ہی کے اسٹیشن سے حجاج کا قافلہ
۱۲ر شوال کو روانہ ہوا تھا، گذر چکا کہ دو تین دن اٹاوہ میں بھی صرف ہوئے، کم از کم تین دن اور
بھی بمبئی تک پہنچنے میں خرچ ہوئے ہوں گے۔ گویا سمجھنا چاہئے کہ شوال کے دو عشرے
بمبئی پہنچتے پہنچتے ختم ہو چکے تھے، اور گو اس زمانہ میں دخانی جہازوں سے سمندر کا راستہ
طے ہونے لگا تھا، بادبانی جہازوں کے حساب سے نسبتاً جدہ لوگ بہت کم وقت میں
پہنچ جاتے تھے، لیکن پھر بھی دخانی جہازوں کے رواج کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ریل ہی میں
آپ دیکھ چکے کہ پسنجر ٹرین اس زمانہ میں صرف دن کو چلتی تھی، اور شب گذاری کے لئے
رات بھر کسی اسٹیشن پر ٹھیر جاتی تھی، کچھ یہی حال دخانی جہازوں کا بھی تھا، اور وہ بھی غریب
حاجیوں کا جہاز، جس کے ساتھ طرح طرح کے شاخسانے لگے ہوئے تھے، کہیں
قرنطینہ[1] کی مصیبت تھی، کہیں کچھ تھا، کہیں کچھ تھا۔ رفتار میں بھی اتنی سرعت
پیدا نہیں ہوئی تھی۔

بہر حال بمبئی تک تو حاجیوں کا قافلہ پہنچ گیا، عام خیال یہی تھا کہ تین چار دن میں جہاز
مل جائے گا، لیکن سنئے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے کہ

"بمبئی پہنچ کر قافلہ کو بائیس دن تک ٹھیرنا پڑا"

جس کے معنی یہی ہوئے، کہ شوال کا مہینہ ہی نہیں بلکہ ذیقعدہ کا بھی ایک عشرہ بمبئی ہی میں

---

[1] قرنطینہ کی مصیبت کا اندازہ اسی سے کیجئے کہ فقیر جس زمانہ میں حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوا، اس سال جزیرہ کامران میں صرف ایک دن کے لئے حاجیوں کو اتارا گیا، اور دوسرے دن ہم لوگ جہاز پر سوار ہو گئے، لیکن اسی کتاب تذکرۃ الرشید میں مولوی عاشق الٰہی صاحب نے حضرت گنگوہی کے تیسرے حج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
دس دن تک قرنطینہ میں حاجیوں کو ٹھیرنا پڑتا تھا۔ جہازوں کی رفتار کا حال یہ تھا کہ عدن تک سات دن میں جہاز پہنچا تھا" صفحہ ۲۴۳ ج ۱

گذر رہا تھا، اس زمانہ کے بحری سفر کی نزاکتوں کا اندازہ کرتے ہوئے، سوچئے کہ قافلہ والوں پر کیا گذر رہی ہوگی، بقول مولوی عاشق الٰہی صاحب قافلہ والوں کو

"جہاز کا انتظار تھا، مگر اگبوٹ تھا کہ آنے کا نام نہ لیتا تھا، لوگ گھبراتے اور تنگ آئے جاتے تھے" ص ۲۳۵

جن لوگوں نے چند دن پہلے دیکھا کہ سیٹی دینے کے بعد بھی "ڈاک گاڑی" روک لی گئی، اور تقریباً آدھ گھنٹہ تک صرف چیختی ہی رہی تھی، ان ہی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بمبئی پہنچنے کے بعد آخر یہ رکاوٹ کیوں پیدا ہو رہی ہے۔ آخر وہی خدا اس اگبوٹ کو کیوں نہیں بھیج رہا ہے، جس نے چلنے والے انجن کو روک لیا تھا، صبر کا پیمانہ جب قافلہ والوں کا لبریز ہو گیا، تب اور کسی کو تو جرأت نہ ہوئی، لیکن ہمارے مصنف امام جو سیدنا الامام الکبیر کے محرم راز ہونے کے ساتھ ساتھ بہر حال استادزادے بھی تھے، ان سے نہ رہا گیا، اور اگبوٹ کی تاخیر کا جو راز تھا اس کا افشاء انہوں نے کر ہی دیا۔ قافلہ کی پریشانی کو دیکھ کر جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے،

"ایک دن مولانا محمد یعقوب صاحب (قافلہ والوں سے) فرمانے لگے کہ آج معلوم ہوا ہے کہ سارے قافلہ کو مولانا محمد قاسم صاحب روک رہے ہیں"

کیوں روک رہے ہیں؟ تار دے کر جو بلائے گئے تھے، ان ہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ

"ان کے (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب کے) چند رفقاء و متوسلین ضلع مظفر نگر سے آنے والے ہیں، جب تک وہ نہ آجائیں گے، اس وقت تک نہ جہاز آوے نہ جاوے" ص ۲۳۵

اور یہی دیکھا بھی گیا، مولوی عاشق الٰہی کا بیان ہے کہ

"ان لوگوں کو (یعنی غیر مستطیع لوگوں کو) دے دیتے تھے"

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ ان لوگوں کے مصارف کی ذمہ داری بھی سیدنا الامام الکبیر نے اپنے ذمہ لے لی تھی، صحیح طور پر اگرچہ نہ اسی کا پتہ چلتا ہے کہ آمدنی جو ہوئی تھی، اس کی مقدار کیا تھی، اور نہ ان لوگوں کی واقعی تعداد بتائی جاسکتی ہے جن کے مصارف سفر حضرت والا کی طرف سے ادا کئے گئے۔ لیکن آگے اسی روایت میں میر شاہ خاں مرحوم کی اطلاع کے الفاظ یعنی سیدنا الامام الکبیر سے

"ساتھیوں نے کہا کہ حضرت آپ تو سب ہی دے دیتے ہیں کچھ تو اپنے پاس رکھئے"

تو جواب میں برجستہ مشہور حدیث نبوی

انما انا قاسم واللہ یعطی	میں تو سوائے اس کے کہ بانٹنے والا ہوں اور کچھ نہیں ہوں، دے تو رہا ہے اللہ

کے الفاظ زبان مبارک پر جاری ہوئے یہ عجیب وغریب حدیث آج بھی دار العلوم دیوبند کی تاریخی یادگاروں، اور نمایاں کاغذات میں بطور "طغرائے امتیاز" یا مونوگرام استعمال ہوتی ہے، اور نبوت ہی کے دوسرے انکشاف یعنی الاسماء تنزل من السماء (یعنی لوگوں کے نام جو رکھے جاتے ہیں، وہ بھی آسمان ہی سے نازل ہوتے ہیں۔) سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔

خیر یہ قصہ تو ایک مستقل قصہ ہے بسلسل عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ بٹنے پر جو پل جاتا ہے اس کو کس کس رنگ میں بقار بخشی جاتی ہے، اور کہاں کہاں سے کتنا حصہ دیا جاتا ہے، پس سرفرازیوں کی اسی مد میں اس کو بھی شمار کرنا چاہئے اس وقت تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر نے ان لوگوں کو جو اجازت دی تھی، وہ سوچ سمجھ کر دی تھی، آپ کے پاس جو کچھ جمع کرایا گیا تھا، وہ بانٹنے ہی کے لئے جمع کیا گیا تھا۔

"یلملم کے قریب جس وقت جہاز پہنچا، اور کپتان نے اطلاع دی کہ
"حاجیو! احرام باندھ لو" تو حضرت امام ربانی (مولانا گنگوہیؒ) نے
وعظ بیان فرمایا، اور ارکان وضروریات حج سے لوگوں کو آگاہ کیا۔" ص۲۳۷

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر اپنے جن کلمات طیبات سے لوگوں کو مستفید فرماتے تھے، ان کی نوعیت باضابطہ وعظ اور تقریر کی نہ تھی، بلکہ لوگوں میں ملجل بطور عام گفتگو اور بات چیت کے جو کچھ فرمانا ہوتا، فرماتے۔ اور ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب صاحب جب تشریف لے آتے، تو علاوہ علمی نکات کے مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے، کہ کچھ تصوّف کے رنگ کی باتیں بھی ہوتیں، ان کے الفاظ یہ ہیں کہ

"حضرت مولٰنا محمد یعقوب، اور مولٰنا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہما میں کشوف کونیہ کے اکثر ذکر و تذکرے ہوتے، مکاشفات بیان کئے جاتے، خوابیں ظاہر کی جاتیں۔ غلبۂ ظن پر رائے زنی ہوتی، اور درویشانہ صوفیانہ چھیڑ چھاڑ برابر قائم رہتی تھی۔" ص۲۳۳

زیادہ تر یہ رجحان مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ پر غالب تھا، جس کا اندازہ ان کے حالات سے ہوتا ہے، ارواح طیبہ میں میر شاہ خاں صاحب کے حوالہ سے یہ قصہ ان ہی کے متعلق بیان کیا گیا ہے، کہ خود ہی فرماتے تھے، رات اللہ میاں سے کچھ عرض ومعروض کر رہا تھا، لیکن شنوائی نہ ہوتی تھی۔ اصرار جب میری طرف سے زیادہ بڑھا، تو مجھے جھڑک دیا گیا، اور ارشاد ہوا کہ "بس چپ رہو، بکو مت" پھر میں نے توبہ استغفار کیا، اور معافی ہوگئی، لکھا ہے، کہ اس قصہ کو سیدنا الامام الکبیر کے سامنے ایک صاحب دہرانے لگے، تو آپ اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے،

"اخو مولوی یعقوب نے ایسا کہا، توبہ توبہ، بھائی یہ انہیں کا کام تھا"

کیونکہ وہ مجذوب ہیں، اگر ہم ایسی گستاخی کرتے، تو ہماری گردن نپ جاتی " ص۲۳۶ ارواح

بہرحال کچھ اسی قسم کے دینی اور علمی مشغلوں میں دریا کا یہ جہازی سفر پورا ہو رہا تھا، سب سے زیادہ ولولہ انگیز نظارہ جیسا کہ مولوی عاشق الٰہی نے لکھا ہے نماز کے وقت پیش ہوتا، یعنی جس وقت

"جہاز میں بڑی لمبی صف بندی ہو کر پانچوں نمازیں جماعت سے ادا ہوا کرتی تھیں "

تو ان ہی کا بیان ہے کہ اور تو اور جہاز کا فرنگی نژاد کپتان

"اس پیاری عبادت کو سلیم و سلیس انداز کے ساتھ ادا ہوتے دیکھتا تو خوش ہوتا، اور مسلمانوں کی اس عبادت پر تعریف کیا کرتا تھا " ص۲۳۶

گویا پانچوں وقت جماعت کی یہ شاندار، پُرشوکت نماز جہاز کے غیر مسلم عناصر کے لئے اسلامی دعوت کا ایک خاموش قالب تھا۔ کپتان اس درجہ ان لوگوں سے متاثر تھا، کہ اسی کی خواہش سے جب ایک سرٹیفکٹ حج کرنے والے مسافروں کی طرف سے دیا گیا، تو لکھا ہے، کہ

"کپتان نے اس کو چوما، اور آنکھوں سے لگایا، پھر سر پر رکھ لیا اور کہا کہ "یہ میرے لئے سند ہے" " ص۲۳۶

راستہ بھر بجائے کسی قسم کی تحقیر کے دیکھا جاتا تھا کہ آتے جاتے ہوئے راستہ کپتان کو نہ ملتا، تو لجاجت سے کہتا

"حاجی بابا! ذرا سا راستہ دے دو، ہم نکل جائے " ص۲۳۵

اللہ اللہ یہی دین اور مذہب ہے جس کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے، کہ جنگ و جدال

بغیر حساب (الزمر) | بغیر حساب کے

جیسی قرآنی آیتیں جیتی جاگتی شکلوں میں ان کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں، اوساں کی مجاہدانہ مساعی کا پاکیزہ صلہ دنیا میں بھی ان کے سامنے تھا۔ جس کی طرف آیۃ کریمہ اشارہ کر رہی ہے۔ بلکہ ہم جب سوچتے ہیں کہ یہی حج سیدنا الامام الکبیر کا آخری وداعی حج تھا۔ اور ٹھیک اسی سال مکہ معظمہ کا یہ ایوان عالی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، اسی مختصر زمانہ میں مکہ جیسے شہر میں نہر زبیدہ کھینچ کر اس مکان کے دروازے پر اس طریقہ سے پہنچا دی گئی، کہ حارۃ الباب کا وہی محلہ جہاں بقول حضرت تھانوی رح

"آب شیریں حکم چشمۂ آب حیات رکھتا تھا۔" ص۳۲ کرامات امدادیہ

وہیں کے گلی کوچوں میں نہر کا پانی دوڑتا پھرتا تھا اور اسی مکان کے دروازے پر نہر کا ایک چشمہ ابل رہا تھا، کون کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کس کیلئے تھا، اور کسے اپنے احسانی اعمال کے نتائج کا تجربہ کرانا مقصود تھا۔ بغیر حساب و شمار کے جس صبر کا اجر سامنے آنے والا تھا، کیا اسی کی ہلکی سی جھلک تھی جو بلد اللہ الحرام میں دکھائی جارہی تھی۔

مکہ معظمہ کے اس مکان میں اتر جانے کے بعد نشاط و انبساط کی جن کیفیتوں سے ان بزرگوں کے منور قلوب معمور تھے، اس کا اندازہ حکیم منصور علی خاں حیدر آبادی کی اس روایت سے بھی ہوتا ہے

انہوں نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہ دروازے کے اوپر کے بالاخانہ پر ٹھیرا دینے کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دستور تھا، کہ اپنے دونوں عزیز مہمانوں سے ملنے کے لئے کبھی کبھی خود اوپر تشریف لے جایا کرتے، جوں ہی حاجی صاحب پر دونوں کی نظر پڑتی،

"کھڑے ہو کر تعظیم دیا کرتے تھے، اور نہایت مؤدب دوزانو ہو کر ان کے روبرو بیٹھ جاتے۔"

بعض تجربات اس کو ہوئے تھے، جن کی وجہ سے حالت اسی نفاع کی یہ ہو گئی تھی، حاجی صاحب ہی فرماتے تھے، کہ ان کی

"کبھی دست بوسی کرتا کبھی پابوسی"۔ ص۴۳

اسی کا نتیجہ جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، یہ تھا، یہ بھی حاجی صاحب ہی کا بیان ہے، کہ

"جب مدینہ منورہ کو قافلہ جاتا تھا، اول میرے احباب کو لیتا تھا، بعد کو وہ دوسرے مسافروں کا متلاشی ہوتا تھا"۔ ص۴۳ کرامات امدادیہ

ظاہر ہے، کہ احباب ہی نہیں بلکہ "ایشان بجائے من و من بجائے ایشان" کے خطاب سے سرفراز ہونے والے حاجی صاحب کے روحانی فرزندوں کی مدینہ منورہ کی طرف روانگی کا مسئلہ جب پیش آیا ہوگا، تو جو سہولتیں میسر آئی ہوں گی، ان کو آنا ہی چاہیے تھا، گویا سمجھنا چاہیئے، کہ مکہ سے مدینہ تک اپنی ہی سواریوں پر یہ حضرات روانہ ہوئے ہوں گے مولانا عاشق الٰہی مرحوم نے لکھا ہے کہ

"بعد حج سلطانی راستہ سے مدینۃ الرسول روانہ ہوئے"۔ ص۲۳۹

اسی سلطانی راستہ پر مدینہ منورہ کے پاس وہ مقام آتا ہے، جہاں سے "قبہ خضرا" کی دید کے تمنائیوں کی، آرزو کی تکمیل کا آغاز شروع ہو جاتا ہے، عام طور پر جبل مفرح کے نام سے موسوم ہے، مولانا حکیم منصور علی خاں صاحب حیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے، کہ

"جب منزل بمنزل، مدینہ شریف کے قریب ہمارا قافلہ پہنچا، جہاں سے روضہ پاک، جناب لولاک نظر آتا تھا"۔

لے بدوؤں ہی کے کسی دوسرے شیخ سے نفاع کی جنگ ہوئی تھی، جس میں بندوق کی گولی اس کی ٹانگ میں پیوست ہو گئی تھی، جو کسی طرح باہر نہیں ہوتی تھی، خواب میں حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس نے دیکھا کہ اس کے پاؤں کو دبا رہے ہیں، اور گولی کو باہر نکال کر پھینکدیا۔ صبح کو گولی خود بخود باہر نکل گئی ۱۲

ادر بھول کے ان قصوں میں بظاہر زیادہ دخل ہوتا ہے، فرادیکھئے یہی ناگزیر داقعہ جو اس
وقت زیر تذکرہ ہے اور تو اور ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ
جیسے بزرگ جو صبر و سکینہ میں شاید اپنے وقت میں اپنی آپ نظیر تھے[1]۔ خدا شناسی کے
میلہ میں جو کچھ دیکھا گیا تھا' صرف اسی کو ملاحظہ فرمانے کے بعد جہاں اپنے باطنی احساس
کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا تھا' سنا ہی چکا ہوں' کہتے تھے کہ حق تعالیٰ کو ان سے (یعنی
سیدنا الامام الکبیر سے) جو کام لینا تھا' وہ پورا ہو چکا' صرف یہی نہیں، بلکہ اسی کے
ساتھ یہ بھی کہ

"مجھے مولٰنا کی وفات قریب معلوم ہوتی ہے" صنا ارواح ثلاثہ

لیکن وہی وقت جب قریب سے قریب تر ہو گیا' براہ راست ان ہی مولٰنا محمد یعقوب صاحب
کو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ بالا وصیت سیدنا الامام الکبیر کے متعلق فرماتے
ہیں، جس کا مطلب ان ہی کے بیان کے مطابق وہی تھا' جس کا احساس خدا شناسی
کے میلہ کے واقعات کے بعد ہی ان کے قلب مبارک میں پیدا ہو چکا تھا، لیکن جب
حاجی صاحب نے چونکایا تو یہی نہیں کہ جو چیز ان کو خود اپنے قلبی اشراق کی روشنی میں
نظر آچکی تھی' وہ ان کے دماغ سے اوجھل ہوگئی، حاجی صاحب کی تنبیہ پر بھی وہ یاد نہ
آئی، بلکہ اس واقعہ کو سامنے کر کے جیساکہ خود ہی اتمام فرماتے ہیں۔

"نہ کچھ پہلے حج سے بھی طبیعت ناساز تھی" صلا۲ سوانح قدیم

---

[1] قصص الاکابر میں حضرت تھانوی رح کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ چودہ آدمی ان کے
گھر کے اس سے پیش تر چند ہفتوں کے اندر اندر مر چکے تھے۔ حکیم الامت رح نے جو ان کے براہ
راست شاگرد تھے مذکورہ بالا الفاظ کے بعد یہ بھی فرمایا کہ وہ یعنی مولٰنا محمد یعقوب صاحب بڑے
صابر تھے کبھی نہ روئے نہ کوئی بے صبری کی بات منہ سے نکالی" صرف ایک دفعہ مولانا تھانوی رح نے
سنا تنہائی میں مولانا روم کا یہ شعر پڑھتے تھے ۔ جز بہ تسلیم و رضا کو چارۂ + در کف شیر نر خونخوارۂ -
(قصص الاکابر صلا۲)

مصنف امام نے بھی لکھا ہے کہ

"مولنا نے برخلاف عادت اس مرض میں جو علاج ہوا، اس کو قبول کیا، جو دوا کھلائی کھائی، جو تدبیر کسی نے کی، اس کو کرلیا"۔ ص۲۴۴

ابتداء علالت ہی میں آپ دیکھ چکے، کہ جہاز کے ڈاکٹر کے علاج سے بھی آپ نے انکار نہیں فرمایا، اور جس شخص کا حال انگریزوں کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں کے متعلق یہ تھا کہ ساری عمر بجائے بٹن کے گھنڈیوں ہی کے استعمال پر اس لئے اصرار کرتے رہے کہ بٹن کو بھی ان ہی چیزوں میں شمار کرتے تھے، جن سے ملک کو انگریزوں نے روشناس کیا تھا، مگر باوجود اس کے کونین جو اس زمانہ میں اچھی خاصی بدنام دوا تھی، انگریزوں کی اس دوا کو بھی بخوشی آپ نے استعمال فرمایا، اور کونین ہی کی وجہ سے انگریز ڈاکٹر کے احسان کو جو شوربے کے لئے مرغ دے کر اس نے کیا تھا، اس احسان کے اٹھا لینے پر بھی آمادہ ہو گئے، اور یہ واقعہ تو خیر جہاز کا تھا، وہاں تو گونہ ایک قسم کی مجبوری کا بھی عذر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وطن واپس ہونے کے بعد پہلے تو آپ کے مشہور فدائی طبیب دیوبند کے رہنے والے حکیم مشتاق احمد صاحب[1] مرحوم نے آپ کا علاج اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

---

[1] حکیم صاحب مرحوم کا ذکر مختلف مقامات پر گذر چکا ہے، مولنا طیب صاحب نے اپنے خط میں ان کے متعلق لکھا ہے، کہ

"دیوبندی شیوخ کی برادری میں اول نمبر کے آدمی سمجھے جاتے تھے، حاذق طبیب تھے جنکی طرف سارا شہر رجوع کرتا تھا"۔

سیدنا الامام الکبیر سے نیازمندی اور فدائیت کا جو تعلق رکھتے تھے، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولنا نے لکھا ہے کہ

"حضرت کے خاص لوگوں میں تھے، اور حضرت کے فدائی تھے"۔

یہ بھی ان ہی کا بیان ہے کہ

"حکیم صاحب مرحوم نے اپنے مال کا وافر حصہ حضرت (سیدنا الامام الکبیر) پر خرچ کیا"۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

یہ دوسروں سے سنی سنائی خبریں نہیں ہیں، بلکہ اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھ رہے تھے، اپنی دینی اور علمی ذمہ داریوں کے ساتھ اسی کی تعبیر مذکورہ بالا الفاظ میں وہ فرما رہے ہیں۔ اسی موقعہ پر لکھنؤ کی ککڑیوں کا وہ قصہ بھی فقیر نے یاد دلایا تھا جس کا ذکر ارواح ثلاثہ میں کیا گیا ہے، یعنی حضرت مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی مرحوم تک کسی ذریعہ سے یہ خبر پہنچی کہ سیدنا الامام الکبیر کے دل میں ککڑیوں کے کھانے کی خواہش پیدا ہوگئی ہے۔ جو دیوبند اور اطراف دیوبند میں آج کل نہیں مل رہی ہیں۔ بیان کیا گیا تھا کہ سننے کے ساتھ ہی لکھنؤ سے ایک دفعہ نہیں، بلکہ متعدد بار بذریعہ پارسل ککڑیوں کے بھجوانے کا نظم مولانا فرنگی محلی نے فرمایا، اور وہ برابر حضرت والا کی خدمت میں پہنچتی رہیں، میں نے اس وقت بھی عرض کیا تھا، کہ کسی حکمرانِ وقت، یا بادشاہ کے لئے بھی یقیناً مولانا فرنگی محلی اس زحمت کو برداشت کرنے پر شاید ہی آمادہ ہوتے۔ اسی لئے مصنف امام نے جو کچھ ارقام فرمایا ہے، کم از کم مجھے تو اس پر تعجب نہیں ہوتا۔

مگر یہ سب کچھ ہوتا رہا، عرب و عجم یا دیسی بدیسی علاج و معالجہ کے ہر طریقہ کا ممکنہ وسیع سے وسیع پیمانہ پر انتظام کرنے والے کرتے رہے، سچ تو یہ ہے، کہ اپنے خون، اور شایدان عاشقانِ صادق کی جان کی بھی ضرورت ہوتی، تو اس کے پیش کرنے میں غالباً وہ پس و پیش نہ کرتے[۱]۔ مگر بقول مصنف امام

> "مرض رفع نہ ہوا، دو برس اسی کیفیت پر گذر گئے، کہ گاہ کچھ صورت تخفیف کی ہو کر قدرے طاقت آئی، اور پھر دورہ سانس کا ہوا، اور وہی صورت ضعف کی ہو گئی"۔ ص ۴۴

---

[۱] آگے اس کا ذکر کیا بھی جائے گا کہ ظاہری اسباب سے مایوسی کے بعد ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب ہی نے دربارِ الٰہی میں یہ درخواست پیش کی تھی کہ میری بقیہ عمر جتنی مدت باقی ہے، وہ مولانا کو عطا فرما دی جائے، جان کے پیش کرنے کے سوا آپ ہی بتائیے کہ اسے اور کیا سمجھنا چاہیے ۱۲

مولٰنا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے کہ

"حافظ بہادر دیوبندی نے دو ماہ پیش تر از وفات خواب دیکھا کہ
رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے دایاں ہاتھ حافظ بہادر کے سر پر
رکھا اور بائیں ہاتھ سے بہت زور سے اپنی دائیں پسلی کو پکڑا، حافظ
بہادر نے عرض کیا کہ حضرت آپ نے پسلی کیوں پکڑی، فرمایا میری
پسلی میں شدت سے درد ہے۔"

حافظ بہادر کی آنکھ اس کے بعد کھل گئی، خواب سے وہ غیر معمولی طور پر متاثر تھے، سیدنا الامام الکبیر کی خدمت میں حاضر ہو کر جو کچھ خواب میں دیکھا تھا، بیان کیا، مولٰنا طیب صاحب نے ارقام فرمایا ہے کہ خواب کو سننے کے بعد اسی کی تعبیر کے متعلق اس اصولی مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے کہ

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دائیں پسلی سے مراد علماء باعمل ہیں، اور
بائیں پسلی سے مراد فقراء۔"

خواب کی تعبیر یہ دی گئی کہ

"معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں میں کسی بڑے عالم کا انتقال ہوگا۔"

اہل مجلس جو بیٹھے ہوئے تھے سب ہی نے یہ تعبیر سنی۔ لیکن تعبیر دینے والا ہی خود اس خواب کی تعبیر ہے، بھلا اس کی طرف اپنے ذہن کو منتقل ہونے کی کون اجازت دے سکتا تھا؟

حالت تو یہ تھی، خواب ہی کا ایک قصہ ہمارے میر شاہ خاں مرحوم بیان کرتے تھے یہ رؤیا خود ان ہی کی تھی، خاں صاحب مرحوم کو حضرت والا کی ذات مبارک سے جو والہانہ عقیدت تھی، جو اس سے واقف ہیں، غالباً ان کے اس خواب پر انھیں تعجب نہ ہوگا، کہتے تھے کہ اسی زمانہ میں جب حضرت والا کی علالت خطرناک صورت اختیار

کر چکی تھی۔

"میں نے دیکھا کہ کوئی صاحب جو اپنی ظاہری شکل و صورت سے معلوم ہوتے تھے کہ اہل اللہ کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں میں نے ان کو دیکھ کر عرض کیا کہ ہمارے مولٰنا محمد قاسم صاحب کو اس شدت کی تکلیف مرض کی کیوں ہو رہی ہے، انہوں نے تین مرتبہ فرمایا کہ کیا مولوی محمد قاسم صاحب کے مثل کوئی دوسرا شخص بھی ہے؟"

پھر خود جواب دیا کہ "نہیں ہے۔"

میر شاہ صاحب فرماتے تھے کہ

"میں نے خواب ہی میں ان بزرگ سے عرض کیا کہ اسی وجہ سے تو میں بھی عرض کرتا ہوں کہ باوجودیکہ مولٰنا بے مثل ہیں، پھر ان کو تکلیف کیوں ہے؟"

بزرگ صاحب نے خاں صاحب کو جواب دیا کہ

"مولٰنا کو کچھ تکلیف نہیں ہے، اور نہ کوئی مرض ہے۔"

اسی کے ساتھ خواب ہی میں خان صاحب کو ان ہی بزرگ صاحب نے مطلع کیا کہ

"ایک بہت بڑا معاملہ در پیش ہے، اور اسی کی وجہ سے ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا بیمار ہیں۔"

خان صاحب کہتے تھے کہ میں نے تب دریافت کیا، یہ معاملہ کیا ہے؟ جواب میں ان سے کہا گیا کہ

"مولٰنا نے جناب باری میں یہ درخواست پیش کی ہے، مجھ کو جو حضورؐ نے طلب فرمایا ہے، تو میں بخوشی حاضر ہوں، مگر میری ایک عرض

"وہ جواب بھی موقوف ہوگیا۔"

اللہ اللہ میرا قلم جب کانپ رہا ہے، انگلیاں تھرا رہی ہیں، خدا ہی جانتا ہے کہ مصنف امام کا اس وقت کیا حال ہوگا، جب کاغذ ان الفاظ سے سیاہ ہو رہا تھا۔

"ایک تشنج کی آمد شروع ہوئی، اس کو نزع سمجھا، اور یوں جانا کہ اب وقت آخر ہے۔"

مگر جیسا کہ ان ہی کا بیان ہے کہ اس کیفیت میں ذرا طوالت پیدا ہوگئی، منگل کا دن ختم ہو کر بدھ کی رات داخل ہو چکی تھی، وہی لکھتے ہیں کہ

"وہ رات اور دن، اور اگلی رات، اور دوپہر جمعرات کی اسی کیفیت پر گذری۔"

گویا بدھ کی رات کے ساتھ اس کا دن بھی، اور دن کے بعد جمعرات کی شب، کے بعد دوپہر تک جمعرات کا دن بھی اسی کیفیت میں گذرا۔

عالم محسوس اور شہادت میں رہنے والوں کے سامنے تو یہ جگر خراش، اور روح گداز فاجعہ پیش تھا، لیکن غیب میں کیا ہو رہا تھا، ان ہی چند دنوں، یا ان سے ایک دو دن پہلے بعضوں پر کبھی کبھی بحالت خواب کوئی تجلی اس کی پڑ جاتی تھی، سیدنا الامام الکبیر کے خادم خاص حاجی محمد یٰسین دیوبندی جن کا ذکر متعدد حیثیتوں سے گذر چکا ہے، مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ ان ہی حاجی محمد یٰسین صاحب کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے سرفرازی ہوئی، حاجی صاحب پر ظاہر کیا گیا کہ

"واسطے عیادت مولانا مرحوم کے تشریف لائے ہیں"

اسی طرح دار العلوم کے ایک طالب علم مولوی احمد اللہ نامی جو نجیب آباد کے رہنے والے تھے، انہوں نے تو جمعرات ہی کے دن چند گھنٹہ پہلے خواب میں دیکھا،

"مدرسہ کے احاطہ میں ایک مکلف مکان ہے، جس کے اندر ایک مرصع کرسی بچھی ہوئی ہے، اس پر سرورِ کائنات خاتم المرسلین رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ فرما ہیں، اور آپ کے ارد گرد آپ کے خلفاء اربعہ راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کھڑے ہیں۔ دوسری طرف ایک پرا ان کو فرشتوں کا بھی نظر آیا، مولوی احمد اللہ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ کیسے تشریف آوری ہوئی، جواب میں ارشاد ہوا کہ

"مولوی محمد قاسم صاحب کو لینے آیا ہوں"

مولوی احمد اللہ کا بیان ہے کہ

"سامنے ایک پلنگ پر سوار دیکھا کہ مولانا آئے"۔

اس کے بعد مولوی احمد اللہ صاحب کو جو کچھ دکھایا گیا، ان ہی کے الفاظ میں سنئے، کہتے تھے، میں نے دیکھا

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مولانا کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے فرما رہے ہیں

اے حبیب آنے میں کیا دیر ہے"

مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ تشنج کی کشمکش کے اختتام سے دو گھنٹے پہلے کہتے ہیں، کہ مولوی احمد اللہ صاحب کو یہ رؤیا ہوئی تھی، اللہ اللہ فداہ ابی وامی ؎

بچہ ناز رفتہ باشد زجہاں نیازمندے
کہ بجاں سپردن او بکرشمہ رسیدہ باشی

اور یہ مکاشفات بامنامی مبشرات تو ان لوگوں کے تھے، جو غیبی تجلیات سے اثر پذیری

اور عکس گیری کی فطری مناسبتوں، جبلی صلاحیتوں سے سرفراز تھے، وہ تو جو دیکھ رہے تھے یا ان کو جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اسے تو چھوڑیئے، میں تو پوچھتا ہوں کہ اسی عالم محسوس یا دائرۂ شہادت کے مشاہدات، یعنی غشی کا طاری ہونا، دورا تیں اور تقریباً ڈیڑھ دن تک تشنج کی اسی کیفیت کا تسلسل جسے مصنف امام بھی "نزع" ہی کی کیفیت سمجھتے رہے، ان کو بھی باور ہی کرنا پڑا کہ یہ "وقت آخر" ہے۔ سوال یہی ہے، کہ جن کے حافظہ میں بخاری شریف کی روایت کا جزء

غشی علیہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وفات سے پہلے غشی طاری ہو گئی تھی،

محفوظ ہوگا۔ اور اسی کتاب کی مشہور حدیث کا فقرۂ نبویہ

لا الٰہ الا اللہ ان للموت لسکرات	لا الٰہ الا اللہ موت میں سکرات کی کیفیتیں ہیں۔

لہ موت کے وقت کی یہ کیفیت جس کی تعبیر قرآن میں بھی سکرۃ الموت کے لفظ سے کی گئی ہے، مرنے والوں پر اس وقت کیا گذرتی ہے، عام خیال تو وہی ہے جس کی تائید حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے قول سے بظاہر ہوتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بعض علماء، مثلاً زرقانی نے شیخ ابو محمد فرجانی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ تلک السکرات سکرات الطرب یعنی مسرت اور نشاط کی شدت سے سکرات کی یہ حالت طاری ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ عربی زبان میں سکرہ کے معنی تکلیف یا دکھ کے نہیں ہیں۔ بلکہ نشہ کی حالت کو سکرہ کہتے ہیں۔ علامہ فرجانی اپنے قول کی تائید میں یہ بھی فرماتے تھے کہ وفات کے وقت حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان مبارک سے سننے والے یہ سن رہے تھے کہ واطرباہ (میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ ہے) اور یہ شعر پڑھتے ؎ غداً نلقی الاحبہ محمداً وحزبہ (یعنی کل ہم اپنے دوستوں سے ملیں گے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے جتھہ سے) بہر حال اگر سکرات میں تکلیف ہی کا کوئی پہلو ہوتا ہے، جسے مرنے والوں کے سوا دوسرے جان نہیں سکتے تو پھر یہی سمجھنا چاہیئے کہ تزکیہ وتطہیر کا رفع مراتب کے لئے نیک بندوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے، ان ہی روایتوں میں جن میں ہر مصیبت اور غم کو مومن کی تطہیر اور پاکی کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے، ان ہی میں ایک روایت یہ بھی ہے۔

المؤمن یوجر فی کل شیٔ حتی الغط فی الموت (تفسیر درمنثور ص۲۲۵ ج ۱۲)	مؤمن کے لئے ہر بات میں اجر وثواب ہے یہاں تک کہ موت کی گھٹن میں بھی۔

کے ساتھ صدیقہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا قول

لا اکرہ شدۃ الموت لاحد بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم	موت کے وقت کی سختی کو میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ناپسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتی،

جن کو اس موقعہ پر یاد آگیا، اور چاہئے کہ یاد آجائے، کیا ان روحانی پرچھائیوں کو اپنے سامنے سے وہ ہٹا سکتے ہیں، جنہیں دیکھ کر بے ساختہ مؤمن اللّٰھم صل وسلم علی حبیبك النبی الامی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم وبارك کے پڑھنے پر مضطر و مجبور ہو جاتا ہے۔

اور یہی کیا سچ تو یہ ہے، کہ ٹھیک ان ہی نازک گھڑیوں میں جب دوسرے تو دوسرے خود ہمارے مصنف امام مولٰنا محمد یعقوب صاحب تک کا یہ فیصلہ جسے نقل کر چکا ہوں یعنی

"اب آخر وقت ہے"

لیکن بایں ہمہ باوجود صدیقی ہونے کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر اچانک فاروقی نسبت پرتو فگن ہے، اور چھپے دبے لفظوں میں نہیں بلکہ بھری مجلسوں میں دیکھا گیا کہ وہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ

"گھبراؤ مت! ابھی دس برس مولٰنا اور زندہ رہیں گے"

قصص الاکابر

حضرت حکیم الامت تھانوی رح اس کے راوی ہیں، ان ہی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں، براہ راست اس قصہ کو خود مصنف امام سے حضرت تھانوی نے سنا تھا فرماتے تھے کہ

جب مولٰنا (محمد قاسم صاحب)، کی شدت مرض سے زندگی

سے مایوسی ہوئی، تو مولٰنا محمد یعقوب صاحبؒ (ہمارے مصنف امام) رجوع الی اللہ ہوئے، اور براہ نازؔ اس طرح دعا کی کہ ہماری عمر انہیں عطا فرمادی جائے۔"

ؔ واقعہ یہ ہے کسی موقعہ پر ذکر کرچکا ہوں کہ مولٰنا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کا حال جہاں صبر و تمکین میں یہ تھا کہ چودہ چودہ جنازے ان کے گھر سے دیوبند میں وبا پھیل جانے کی وجہ سے ہفتہ دو ہفتے میں پیاپے نکلے جن میں خود ان کی اولاد کی بھی کافی تعداد تھی، لیکن زبان سے نہ بے صبری کا کوئی کلمہ ہی نکلا، اور نہ بے قابوی ان کے کسی طرز عمل سے ظاہر ہوئی۔ لیکن باایں ہمہ ان میں ایک دوسرا پہلو بھی تھا، جسے چاہیں تو ہم جذب و سرمستی کی کیفیت کہہ سکتے ہیں، آج سے تقریباً چالیس سال پہلے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی سیرت طیبہ میں اس دعوے کو پیش کرتے ہوئے کہ مسلمانوں کے مجاذیب و بہالیل طبقہ کے سرگردہ صحابہ کرام میں حضرت ابوذر غفاری کی ذات مبارک نظر آتی ہے، فقیر نے مولٰنا محمد یعقوب صاحب کے بھی بعض واقعات و حالات کی طرف اسی موقعہ پر اشارہ کیا تھا، اس وقت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہ خاکسار ہی کو نیاز حاصل کرنے کا موقعہ ملا تھا، اور مجھ جیسے نارسان طالب العلم کے حال سے حضرت والا کے واقف ہونے کی کوئی صورت ہی تھی لیکن تحریر کا یہی حصہ القاسم دارالعلوم کے مجلہ میں جب شائع ہوا، اور حضرت تھانوی کی اس پر نظر پڑی، تو اسی وقت مولٰنا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم کے نام ایک خط لکھا گیا، جس میں ایک مکتوب خاص فقیر کے نام بھی تھا۔ "سید الکاتبین احسن اللہ مناظرہ" کے خطاب سے مخاطب کرتے ہوئے شاباشی دی گئی اور ارقام فرمایا گیا تھا کہ مضمون نگار محقق ہو چکے ہیں، تو یہ مضمون ان کی محققیت کی دلیل ہے، ورنہ "محققیت متوقعہ" کی امید تو بہرحال ہے۔ بہرحال حضرت مولٰنا محمد یعقوب صاحب کی جذبی کیفیت کی بھی اس گرامی نامہ میں توثیق کی گئی تھی، اسی کتاب میں کسی موقعہ پر یہ بھی گذر چکا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر سے مولانا محمد یعقوب صاحب کے کسی قول کا ذکر کسی نے کیا، تو آپ اٹھ بیٹھے، اور فرمایا کہ وہی ایسی باتیں کرگئے ہیں ہم جیسوں کے تو فوراً کان پکڑ لئے جائیں (اوکما قال) حضرت تھانویؒ نے "براہ ناز" سے ان کی اسی زندگی کے اسی پہلو کی طرف شاید اشارہ فرمایا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نسماتی وجود کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے غیب کے کسی عالم میں پیش ہوئے، تو ان کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا کہ یہ کون ہیں! اور عمران کی کیا ہے؟ نام کے ساتھ بتایا گیا کہ ساٹھ سال عمران کی ہوگی حضرت آدمؑ نے فرمایا زدہ من عمری اربعین سنۃ (باقی اگلے صفحہ پر)

آگے اسی روایت میں ہے، کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب اپنی دعا کے بعد کہتے تھے کہ

"میری تسلی کی گئی، کہ ابھی دس سال مولٰنا اور زندہ رہیں گے"۔

خود سوچئے کہ دارالعلوم دیوبند کے صدر اول مولٰنا محمد یعقوب صاحب کی طرف سے یہ اعلان جس وقت کیا جا رہا ہوگا، اس وقت کے سماں کو یاد کر کے اپنے ذہن کو کون روک سکتا ہے، اگر اس کے آگے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے کا وہ نظارہ پیش ہو جائے کہ

سل عمر بن الخطاب سیفہ وتوعد بالقتل من یقول مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کھینچ لی عمرؓ بن الخطاب نے تلوار اور قتل کی دھمکی ہر اس شخص کو دینے لگے، جو یہ بولے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔

(گذشتہ صفحہ سے، یعنی اے پروردگار میری عمر سے چالیس سال ان کو دے دئیے جائیں) یہ حدیث ترمذی وغیرہ کی ہے۔ ممکن ہے کہ مصنف امام کے سامنے کچھ اسی قسم کی چیزیں ہوں ۱۲

لہ یہ عجیب بات ہے کہ مولٰنا محمد یعقوب صاحب بھی یہی فرماتے تھے، جیسا کہ حضرت مولانا تھانوی رح ان ہی سے سن کر نقل کیا کرتے تھے کہ دعا کرنے کے بعد ان کو "مھدی" کے لفظ کا القا ہوا فرماتے تھے کہ میں نے مہدی کے اعداد جو نکالے تو میزان (۵۹) آئی، مولٰنا محمد قاسم صاحب کی عمر اس وقت (۴۹) سال تھی، میں سمجھا کہ (۵۹) سال آپ کی عمر ہو گی، اسی لئے اعلان کر دیا کہ دس سال ابھی اور زندہ رہیں گے۔ لیکن جب ۴۹ سال ہی کی عمر میں وفات ہوئی، تب محسوس ہوا کہ القاء کے سمجھنے میں مجھ ہی سے غلطی ہوئی۔ مراد یہ تھی کہ مہدی علیہ السلام کی عمر ان کو ملے گی، روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں حضرت امام مہدی کا ظہور ہوگا اور (۹) سال قیام فرما کر وفات پائیں گے۔ کہنا یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو یہ فرما رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات نہیں ہوئی ہے تو اس میں بھی ابن اسحاق کی روایت کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی کچھ اجتہادی نتیجے ہی کی نیرنگی تھی، سیرت ابن اسحٰق کے حوالے سے زرقانی نے شرح مواہب میں نقل کیا ہے کہ قرآنی آیۃ یکون الرسول علیکم شہیدا سے اپنے نزدیک وہ یہی سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک مومن کو منافق سے شہادت دیکر آپ جدا نہ کر لینگے۔ ص ۲۸۰ زرقانی ج ۸

حقیقت تو یہ ہے کہ دیکھنے والوں کو جو کچھ دکھایا گیا تھا، حالانکہ بعض وجوہ سے سب کا ذکر مناسب نظر نہ آیا[1]، لیکن ناقابل تردید وثائق کی روشنی میں جو کچھ بھی پیش کر دیا گیا ہے، میرے نزدیک تو ایک طرف نہ ماننے والوں کے سامنے کی اتفاق و بخت کی توجیہ کی بیڑیاں ٹوٹنے کے لئے اگر وہ کافی ہے تو دوسری طرف ماننے والوں پر خوش عقیدگی کی تہمت کی گنجائش بھی اپنا خیال تو یہی ہے، کہ ان شہادتوں نے باقی نہیں رکھی ہے

صدق و صفا، اخلاص و وفا کے ساتھ کوئی آگے بڑھنے کی ہمت تو کرے، خواجہ کی روشِ بندہ پروری[2] ان ہی شکلوں میں اس کے سامنے آئے گی، پہلے بھی اسی کا تجربہ کیا گیا ہے، اور اب بھی جس کا جی چاہے تجربہ کر کے دیکھ سکتا ہے۔

---

[1] مثلاً یہی بات کہ علالت کے آخری دنوں میں "ذات الجنب" کے عارضہ میں بھی سیدنا الامام الکبیر مبتلا ہو گئے تھے، اس میں شک نہیں کہ روایتوں ہی میں یہ بھی آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات جس بیماری میں ہوئی وہ ذات الجنب کی بیماری نہ تھی، لیکن ان ہی روایتوں میں یہ بھی ہے کہ آپ کی وفات ذات الجنب ہی کی بیماری میں ہوئی، حافظ ابن حجر نے دونوں روایتوں میں تطبیق دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ ذات الجنب کی ایک قسم تو ایسی ہے جس کے متعلق حدیثوں میں آیا ہے کہ شیطان کو اس میں دخل ہوتا ہے، لیکن ذات الجنب ہی کی ایک قسم اور ہے جس میں پسلی کی ہڈیوں کے اندر ریاح اٹک جاتی ہے۔ لکھا ہے کہ یہ عام عارضہ ہے پس حضرت عائشہ رضکا یہ فرمانا کہ ذات الجنب کی بیماری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، ہم اس حدیث کو دوسری قسم پر محمول کریں گے (دیکھو فتح الباری صفحہ ۱۲۱ ج ۸) طرفہ ماجرا یہ ہے کہ مصنف امام کے بیان سے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر کی وفات ذات الجنب کے اس عارضہ کے بعد ہوئی، لیکن سنہ ۱۲۹۷ھ کی روداد میں مولانا رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ نے لکھا ہے کہ بمرض ضیق النفس ۴۹ سال کی عمر میں بمقام دیوبند اس عالم ربانی کا اس عالم فانی سے انتقال ہوا انا للہ وانا الیہ راجعون صفحہ ۲ گویا یہاں بھی اس مسئلہ میں کچھ اختلاف کا رنگ باقی ہی رہا ۱۲

[2] اس شعر کی طرف تلمیح ہے ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرطِ مزد مکن
کہ خواجہ خود روشِ بندہ پروری داند (حافظ)

محمد طیب غفرلہ

تامل کرتا ہوں، جب تک خوب یقین نہیں ہوجاتا کہ یہی نشانِ قدم ہے، اس وقت تک دوسرا قدم نہیں اٹھاتا۔"

آخر میں یہ بھی فرمایا گیا، کہ

"گو دیر میں پہنچوں، مگر قدم بقدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے چلوں گا۔"[1] ص۵۶ سوانح مخطوطہ

سوانح نگار نے سائیں جی رحمۃ اللہ علیہ کی اس رویار کے ساتھ یہ خبر بھی دی ہے کہ بیدار ہونے کے بعد سائیں جی کے قلب مبارک میں سیدنا الامام الکبیر کی ملاقات کا شدید اشتیاق پیدا ہوا،

آخر کسی نہ کسی طرح اپنی اس آرزو کے پوری کرنے میں کامیاب ہوئے، سیدنا الامام الکبیر پر جوں ہی سائیں جی توکل شاہ کی نظر پڑی، لکھا ہے کہ

"دیکھتے ہی بلا استفسار پہچان لیا، اور معتقدانہ ملے۔" ص۵۶ "

اور کیسے نہ پہچانتے ع

رقم مہر تو بر چہرۂ من پیدا بود

اللہ اللہ جس کا قال ہی نہیں بلکہ حال، واقعی حال

اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری

بن چکا ہو، گلاب کے پھول کو دیکھ کر اس لئے تڑپ اٹھتا ہو، کہ منسوب کرنے والوں نے کسی کی طرف اس پھول کو منسوب کیا ہے۔[2] جس کی فنائیت اس درجہ تک پہنچی

---

[1] میں نے اپنے بزرگوں سے اس رؤیا کا ایک جزو اور سنا ہے اور وہ یہ کہ سائیں صاحب اسی دوڑ دھوپ کے ساتھ بالآخر جب مجمع کو چیرتے پھاڑتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گئے تو دیکھا کہ حضرت نانوتوی وہاں حضور کے پاس پہلے سے موجود ہیں ۱۲ محمد طیب غفرلہ،

[2] تذکرۃ الرشید ارواح طیبہ وغیرہ میں ہے کہ حضرت گنگوہی نے ایک دفعہ لوگوں سے پوچھا کہ گلاب کے پھول سے مولانا محمد قاسم کو کیوں زیادہ محبت تھی پھر خود ہی اس راز کو فاش فرمایا کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہوئی ہو، یاد ہوگا، سوانح مخطوطہ ہی کے حوالہ سے کسی دوسرے صاحب دل کا رویائی مکاشفہ نقل کر چکا ہوں، یعنی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں ان صاحب نے دیکھا کہ معانقہ کا شرف سیدنا الامام الکبیر کو بخشا گیا ہے، معانقہ کے اسی حال میں ان کو محسوس ہوا کہ

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک مولٰنا کے جسم مبارک میں سمانا شروع ہوا، یہاں تک کہ ہر عضو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر عضو مولٰنا میں سما گیا الاسرار مبارک :۔ ص۱

اور یہ سارے تماشے جو آپ کے سامنے پیش ہو رہے ہیں، اسی مٹ جانے ہی کے تو تماشے ہیں، بات بہت پھیل جائے گی، آئیے، اور آخری نظارے کو بھی دیکھ لیجئے۔

مصنف امام کے حوالہ سے سنا چکا ہوں کہ تقریباً شب چہار شنبہ سے پنجشنبہ کی دوپہر تک وہی تشنج وہی غشی کی حالت طاری رہی، اسی سلسلہ میں مولٰنا حکیم منصور علیخاں صاحب حیدر آبادی نے اپنی کتاب میں یہ اطلاع دیتے ہوئے کہ سیدنا الامام الکبیر کی نزاکت حال کو دیکھ کر

> "مولوی رفیع الدین صاحب مہتمم مدرسہ (دیوبند) کے خطوط جا بجا پہنچے کہ اب حالت مرض ترقی پر ہے "جلد چلے آؤ"۔

(بسلسلہ صفحہ گذشتہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینے سے گلاب کی خوشبو آتی تھی، ہے تو یہ حدیث ضعیف، لیکن پھر بھی حدیث ہی ہے، اشارہ آپ کا اس حدیث کی طرف تھا۔ جس میں آیا ہے کہ من اراد ان یشم رائحتی فلیشم رائحة الورد (یعنی میری خوشبو جو سونگھنا چاہتا ہے چاہیے کہ وہ گلاب کے پھول کو سونگھے)، ہاشم بن عروہ کی سند سے سیوطی نے لآلی مصنوعہ میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن عام میں جو یہ مشہور ہے کہ گلاب کا پھول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسینہ سے پیدا ہوا، محدثین نے اس روایت کو موضوع اور جعلی قرار دیا ہے۔ (دیکھو لآلی مصنوعہ ج۲ ص۱۴۸ مطبوعہ مصر)

تھا۔ نیز دارالعلوم دیوبند کی جو روداد سیدنا الامام الکبیر کی وفات کے سال یعنی ۱۲۹۶ھ
میں شائع ہوئی تھی، اس میں بھی اس حادثہ جاں گداز، روح گسل کی خبر دیتے ہوئے،
مولٰنا رفیع الدینؒ نے یہ ارقام فرمانے کے بعد کہ

"یہ واقعۂ جانکاہ ایسا نہیں ہے کہ یکایک زمانہ اور اہل زمانہ بھول جائیں"

پھر مختصر لفظوں میں سیدنا الامام الکبیر کی جلیلہ خدمات کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہوئے کہ

"مدت العمر اسلام، اور اہل اسلام کی خیر خواہی میں رہے اور تمام عمرِ عزیز کو اعلاء کلمۃ اللہ میں صرف فرمایا، واقعی ایسے عالی قدر اولوالعزم صاحب کمال خیر خواہ کافہ اہل اسلام کا انتقال فرمانا عموماً گروہ پاک اسلام پر ایک سخت حادثہ ہے، خصوصاً اس مدرسہ کو کیونکہ اس چشمۂ فیض کا منبع، اور اس آبِ حیات کا مصدر اور اس آفتاب عالمتاب کے مظہر آپ ہی تھے"

آخر میں مولٰنا رفیع الدین صاحبؒ نے ارقام فرمایا ہے کہ

"مگر اللہ تعالیٰ جل وعلا نے ان مسلمانان ہند اور اہل مدرسہ پر رحم فرما کر نعم البدل عطا فرمایا، اور ان کی مصیبت کو نسیاً منسیا کر دیا۔ یعنی جناب مولانا مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی سلمہ اللہ تعالیٰ نے جو مثل مولٰنا مرحوم کے ہیں۔ اور شہرہ آفاق، سرپرستی مدرسہ و اہل مدرسہ کی قبول فرمائی اور اپنا دست شفقت ان کے سر پر رکھا اور جیسے مولٰنا رحمۃ اللہ علیہ ظاہری و باطنی امداد اس مدرسہ کی فرماتے تھے، ایسے ہی مولٰنا موصوف فرماتے ہیں" (روداد ۱۲۹۶ھ صد ۲)

میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے مصنف امام کے طرزِ عمل اور اعلان میں جیسے فاروقی رنگ جھلک رہا تھا، ٹھیک اسی کے مقابلہ میں رسالت کبریٰ کے صدیق اکبر کی تجلی نگاہوں کے سامنے حضرت گنگوہی کو چارپائی کے پاس دیکھ کر اگر کوند گئی ہو، تو آپ ہی بتائیے کہ یہ کوئی اچنبھے کی بات ہو سکتی ہے؟ آخر اس زمانہ میں دیکھنے والے جو یہ چلا اٹھے تھے، کہ

"وفاتِ[1] سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے"

تو آخر وہ کچھ دیکھ ہی تو رہے تھے، تاریخ کے بیسیوں مادوں میں سے سب سے بہتر اسی مادۂ تاریخ کو وقت کے صالحین و قانتین نے جو قرار دیا تھا۔

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ جو کچھ وہ دیکھ رہے تھے، ان کو جو کچھ دکھایا جا رہا تھا، اسی کی تصویر تاریخ کے اس مصرعہ میں اتر آئی تھی۔

بہرحال چارپائی کے پاس تو یہی قطب عالم، محدث وقت، حضرت گنگوہی تشریف فرما تھے، اور جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے۔

"سب احباب امروہہ، مراد آباد، میرٹھ، سہارنپور، نانوتہ وغیرہ کے جمع ہو گئے تھے"

اندر سے پاس انفاس کی آواز کانوں میں آ رہی تھی، کہ جمعرات کے دن بقول مصنف امام

---

[1] سیدنا الامام الکبیر کی وفات کی تاریخیں بہت سی لکھی گئی تھیں، لیکن بالاتفاق پسند کرنے والوں نے سب سے بہتر مادہ تاریخ اسی مصرعہ کو قرار دیا تھا، یہ مولٰنا شبیر احمد صاحب کے والد ماجد مولٰنا فضل الرحمٰن صاحب مرحوم کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ تھا۔ چند دوسرے اشعار کے ساتھ مادہ تاریخ کے اس مصرعہ کو انہوں نے یوں موزوں فرمادیا تھا۔

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدیٰ کی رحلت کا
کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر در و نہ ہے

یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزم عرفاں کا
مثالِ نُہ فلک جام واژگونہ ہے

کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے
لباس چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے

سن وفات لکھی فضل نے ز روئے الم
وفاتِ سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے
۱۲۹۷ھ

"بعد نماز ظہر اچانک دم آخر ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون"

اگرچہ ۱۲۹۶ھ کی مذکورہ بالا روداد میں مولانا رفیع الدین صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے، کہ

"صفحہ جہاں پر، اس قسم کے وقائع اکثر درج ہیں۔"

اور حیات جاودانی کے سب سے بڑے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی جب

انک میت وانھم میتون۔ (الزمر)	تم بھی مرنے والے ہو، اور وے بھی مرنے والے ہیں۔

کے قانون کے نیچے داخل کرتے ہوئے، مسلمانوں کو آگاہ کر دیا گیا تھا،

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علیٰ عقبیه فلن یضر الله شیئاً (آل عمران)	نہیں ہیں محمد مگر ایک رسول، گذر چکے ان سے پہلے بہت سے رسول کیا وہ (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اگر مر جائیں، یا قتل ہو جائیں تو تم پلٹ پڑو گے اپنی ایڑیوں پر، اور جو پلٹ پڑے گا اپنی ایڑیوں پر، وہ اللہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچائے گا۔

قرآن کی اسی بخشی ہوئی آگاہی سے تاریخ اسلام کے سب سے بڑے وقت میں بیہوشوں کو ہوش میں لایا گیا تھا، لیکن باایں ہمہ اسلامی ہند کی امت اسلامیہ جن تیرہ و تار خونیں دنوں سے گذرتے ہوئے اس وقت تک پہنچی تھی، اس حال کو پیش نظر رکھتے ہوئے بے ساختہ خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر یاد ہی آجاتا ہے کہ

پیوستہ روز غمزدگان تیرہ بود تنگ

از روزگارِ تیرہ من، تیرہ تر نہ بود

کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانان ہند کی تاریخ کے تاریک دنوں میں اپنی وقتی نزاکتوں کے

ہاتھا ہے آج کا یہ دن شاید سب سے زیادہ بھیانک سب سے زیادہ سیاہ تھا۔ بہرحال
جوں ہی کہ یہ خبر قصبہ اور قصبہ کے اطراف و نواح میں پہنچی، حکیم منصور علی خاں صاحب کا
بیان ہے،

"ہزار ہا آدمی اطراف و جوانب سے اس وقت چلے آئے" صد ۱۹۱

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف سے خلق اللہ ٹوٹی پڑتی تھی، جو جہاں تھا وہیں
سے گویا یہی کہتے ہوئے چل پڑا کہ ؎

اے دل ز چشم زخم زمانہ فگار شو
اے چشم از تراوش دل اشکبار شو

گریہ و بکا کا ہنگامہ برپا تھا، بقول مصنف امام

"ایک قیامت برپا ہو گئی"

یہ الفاظ بھی ان ہی کے ہیں، کہ

"مولوی صاحب کے انتقال کا سا غم و الم کبھی نہ دیکھا تھا، ایک ماتم
عام تھا، ہر چند شور و غوغا اور سر پیٹنا اور کپڑے پھاڑنا، نہ تھا۔ کیونکہ
بہ برکت صحبت مولانا جتنے لوگ تھے، حدود شرعی سے باہر نہ ہوتے
تھے، مگر ایسا غم عام ہم نے دیکھا نہ سنا"

اپنے اوپر قربان ہو جانے والے عاشق جاں باز کی آخری دید کی تمنا میں جو بھی تھا قریب
سے قریب تر ہونے کی کوشش میں تھا۔ لیکن اس چھوٹے سے مکان میں انسانوں کے
امنڈے ہوئے اس سیلاب کی بھلا کیا گنجائش نکل سکتی تھی، مصنف امام نے
لکھا ہے،

"گھر میں وسعت نہ تھی، مدرسہ میں لاکر جنازے کو رکھا"

لیکن جنازہ ابھی تیار نہیں ہوا تھا، حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی کی روایت ہے،

"مدرسہ میں غسل دیا گیا تھا"

باوجودیکہ ظہر کی نماز کے بعد جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، یہ حادثۂ فاجعہ پیش آیا تھا لوگوں کے ہجوم اور اژدہام کو بھی آپ دیکھ رہے ہیں، لیکن حیرت ہوتی ہے، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"جنازے کو عصر کی نماز کے بعد اٹھایا گیا"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ عصر کی نماز تک جنازہ تیار ہو گیا، اور نماز پڑھ کر لوگ لے چلے، اس لئے لے چلے کہ نماز کے لئے مدرسہ میں بھی دیکھا گیا کہ گنجائش نہ نکل سکے گی۔ مصنف امام کا بیان ہے کہ

"باہر شہر کے میدان میں نماز ہوئی"

افسوس کہ اس میدان کی صحیح نشاندہی نہیں کر سکتا[1]۔ میرے پاس جو وثائق ہیں ان میں اس کی اطلاع نہیں دی گئی ہے[2]۔ بہرحال نماز مدرسہ میں نہیں، بلکہ شہر کے باہر کسی میدان میں ہوئی، لوگ جنازے کو کندھوں پر اٹھائے لئے جا رہے تھے، حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ

"سینکڑوں آدمی جنازہ کو اٹھانا چاہتے تھے"

---

[1] کسی صاحب کو معلوم ہو، تو اس تاریخی میدان کی تعیین فرمادیں۔ بظاہر قیاس یہی چاہتا ہے کہ مدرسہ کے شمال کی طرف قبرستان کے اردگرد آبادی کے باہر جو زمین ہے اسی کے کسی حصہ میں نماز جنازہ ادا ہوئی ۱۲

[2] احقر نے اپنے اکابر سے سنا ہے کہ جس مقام پر حضرت والا کی قبر ہے، یہ پہلے وسیع میدان تھا، اور بہت کافی وسیع تھا، اسی سے ملحق ایک بہت بڑا باغ تھا، اسی میں نماز جنازہ پڑھی گئی تھی۔ مذکورہ میدان اسی دن قبرستان کے لئے وقف کیا گیا، حضرت والا کی وصیت تھی کہ مجھے گورِ غریباں میں دفن کیا جائے اسی وصیت کے مطابق حضرت کے فدائی مرید حکیم مشتاق احمد صاحب نے یہ پورا میدان وقف کر کے قبرستان کیلئے دیدیا، سب سے پہلی قبر اس میں حضرت والا کی ہوئی، اور آج یہ ہزارہا علماء و صلحاء کا مدفن ہے۔ یہ زمین دارالعلوم کے جانب شمال واقع ہے، اب اس میں قبرستان کے اردگرد زراعت بھی ہونے لگی ہے اور قبرستان کے نگراں فقیروں کے کوٹھے اور ہاشمی کچے مکان بھی بن گئے ہیں جس سے میدانی صورت باقی نہیں رہی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"چارپائی چرچر کرنے لگی"

یہ بھی ان ہی کی روایت ہے، کہ اس حال کو دیکھ کر

"حاجی محمد عابد صاحب نے غل مچایا کہ اس قدر، ہجوم جنازہ اٹھانے کو سب مت کرو، چارپائی ٹوٹ جائے گی"

اس شان کے ساتھ اپنے اوپر مٹ جانے والے کو مسلمان اس میدان تک لائے، حکیم صاحب نے اس موقع پر اسی میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قریب مغرب کے باغ میں جاکر جنازے کو رکھا"

جس وقت نماز جنازہ کی صف بندی ہونے لگی، علاوہ عام مسلمانوں کے حکیم صاحب نے یہ بھی دیکھا تھا کہ

"بہت آدمی جنازہ میں کمبل پوش فقراء موجود تھے"

مصنف امام کا بیان ہے کہ

"مغرب سے پہلے نماز ہوئی"

عام مسلمانوں نے جن میں اہل علم و فضل، ورع و تقویٰ کے ساتھ کمل پوش فقراء کی بھی کافی تعداد تھی، جنازے کی نماز پڑھی، اور زمین کا وہی قطعہ جس کے متعلق مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ

"بوقت وفات حضرت (سیدنا الامام الکبیر) نے وصیت فرمائی کہ مجھے گور غریباں میں دفن کیا جائے"

جس کا مطلب یہی ہوا کہ دیوبند کے شیوخ اور سربرآوردہ حضرات کے مقبروں کی جگہ عام اور غریب مسلمان جہاں دفن ہوتے ہیں، وصیت فرمائی گئی تھی کہ ان ہی غریبوں کے

(گزشتہ صفحہ سے) آگے متن میں مصنف نے اسے تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ محمد طیب غفرلہ،

پاس اُنہیں سلادیا جائے، ہندوستان کے آخری اسلامی حکمران نے بھی یہی آرزو کی تھی کہ ؂

شاہوں کے مقبروں سے الگ مجھ کو گاڑیو

ہم بے کسوں کو گورِ غریباں پسند ہے

اسی شاہانہ آرزو کا اعادہ ہندوستان کے ایک فقیر کی طرف سے بھی کیا گیا تھا، اسی آخری وصیت کی تکمیل، بقول مولٰنا طیب صاحب سیدنا الامام الکبیر کے فدائی حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے یوں کی، کہ

"وفات ہی کے دن اپنی ایک ذاتی زمین وقف کر کے اسے گورِ غریباں بنا دیا"

مصنف امام کے اس قول سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے' انہوں نے لکھا ہے کہ

"باہر شہر ایک قطعہ زمین کا حکیم مشتاق احمد صاحب نے خاص قبرستان کے لئے اسی وقت وقف کر دیا"

بہرحال مغرب سے پہلے اسی باغ والے میدان میں جو شہر سے باہر تھا' جنازے کی نماز ادا ہوئی' اور بقول حکیم منصور علی خاں حیدرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

"بعد نماز مغرب کے، جب شب جمعہ شروع ہوئی دفن کیا گیا"

حیرت اسی پر ہوتی ہے کہ ظہر کی نماز کے بعد عصر سے پہلے وفات ہوئی، اور نماز مغرب کے بعد تجہیز و تکفین کے سارے کاروبار سے فراغت ہو گئی۔ عام حالات میں ایسا بہت کم ہوتا ہے، مصنف امام نے بھی یہ ارقام فرماتے ہوئے کہ "بعد مغرب دفن کیا" لکھا ہے کہ حکیم مشتاق احمد صاحب مرحوم کی اسی ارض موقوفہ میں جو گورِ غریباں کے نام سے موسوم کی گئی تھی،

"اول مولٰنا صاحب یعنی سیدنا الامام الکبیر کو دفن کیا"

اور یہی اطلاع مولٰنا طیب صاحب کی بھی ہے کہ اس گورِ غریباں میں

"پہلی قبر حضرت (سیدنا الامام الکبیر) ہی کی ہوئی"

دفن کے وقت تک تو انسانوں کے ہجوم کا یہ حال تھا، جیسا کہ مصنف امام نے لکھا ہے کہ

"اتنا مجمع ان بستیوں میں کبھی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا"

ان بستیوں سے مراد آپ کی اطراف و جوانب کے وہ قصبات ہیں، جہاں شیوخ و سادات وشرفا رآباد ہیں۔ یعنی دیوبند، تھانہ بھون، نانوتہ وغیرہ۔ اسی کے ساتھ حکیم صاحب مرحوم کا ایک عبرت انگیز مشاہدہ یہ بھی تھا کہ کمل پوش فقرا، جو اچانک خدا جانے کہاں سے سمٹ آئے تھے نماز اور دفن کے وقت تو وہ دیکھے گئے، لیکن لکھتے ہیں کہ

"بعد دفن سب غائب ہو گئے"

دفن کے بعد ہی یہ غائب ہو جانے والے رجال کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے کہاں چلے گئے؟ اس کا جواب کیا دیا جا سکتا ہے۔ رات ہو چکی تھی، ایسے وقت میں بجائے قیام کرنے کے ان کا غائب ہو جانا کچھ عجیب سی بات ہے، ورنہ ان کمل پوش فقرار کے سوا رات ہو جانے ہی کی وجہ سے اور جتنے آدمی بھی جہاں کہیں سے آئے تھے دفن کے بعد دیوبند ہی میں قیام کرنے پر مجبور ہوئے۔ حکیم صاحب نے آگے جو یہ خبر دی ہے کہ

"دوسرے دن سے مخلوق رخصت ہونے لگی" ص ۱۹۱

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کہ عام خلقت رات گذارنے کے بعد دوسرے دن اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف واپس پلٹی۔ یہ جمعہ کا دن تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں کی روانگی کا سلسلہ شروع ہوا ہوگا۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ لکھا ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کش مکش کی ایک خاص حالت میں مبتلا ہو گئے۔ حادثہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے جو کچھ تھا، اس کا اقتضا یہی تھا کہ اور کچھ نہیں تو پس ماندوں ہی کی تسلی خاطر کیلئے

کی خدمات سے استفادہ کی مدت جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس سے بھی کم ہے، تاہم یہ واقعہ ہے کہ ایسے محدود زمانہ میں بجائے مقامی مدرسہ کے ہمہ گیر جامعہ کے قالب میں یہ ادارہ آچکا ہے۔ واللہ اعلم میرا خیال تو یہی ہے کہ حضرت گنگوہی کو خواب میں دلہن[1] یا عروس کی شکل میں سیدنا الامام الکبیر کی یہی خدمت غالباً پیش کی گئی تھی، کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت تک دار العلوم دلہن بن چکا تھا، آئندہ اس کی سرپرستی اور نگرانی کا تعلق مولٰنا گنگوہی سے جو پیدا ہوا، اسی کا تمثیل بشکل نکاح ہوا تھا۔

درد کے اس افسانہ، اور غم کی اس کہانی کو ختم کرتے ہوئے اس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ باوجود کافی تلاش اور جستجو کے اس کا علم نہ ہو سکا، کہ سیدنا الامام کے جنازے کی نماز کس نے پڑھائی۔ حضرت مولٰنا گنگوہی کے ہوتے ہوئے خیال تو یہی گذرتا ہے کہ کسی دوسرے کو کیسے آگے بڑھایا گیا ہوگا، لیکن نہ کوئی تحریری شہادت ہی اس سلسلہ میں اب تک مجھے ملی ہے، اور نہ بزرگوں سے کوئی سماعی روایت مجھ تک پہنچی ہے، نیز ان بزرگوں کے ناموں کا بھی پتہ نہ چل سکا، جو "آخری خواب گاہ" میں "بالین آسائش" پر لٹانے کے لئے مرقد انور میں اترے تھے، مصنف امام کے ان الفاظ سے کہ

(بسلسلہ صفحۂ گذشتہ) دین ہے، دیکھا جائے تو سیدنا الامام الکبیر کی پوری زندگی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی فرمان کے مطابق گذری ۱۲

[1] تذکرۃ الرشید میں لکھا ہے کہ حضرت گنگوہی فرماتے تھے کہ "میں نے خواب میں دیکھا کہ مولانا محمد قاسم صاحب عروس (دولہن) کی صورت میں ہیں اور میرا ان سے نکاح ہوا" ص ۲۸۹ خواب حالانکہ کھلا ہوا تھا، حضرت گنگوہی نے خود ہی تعبیر میں فرمایا تھا کہ ان کے بچوں کی تربیت کرتا ہوں۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم پانے والے طلبہ بھی ان بچوں میں شریک ہیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ بزرگوں کی بزرگی کی پیمائش کے عارضہ میں مبتلا ہونے والوں نے اس خواب سے بھی پیمائش کے گز یا فیتہ کا کام لینا چاہا، اللہم اغفر لہم ۱۲

عجباً لاربع اذرع فی خمسة	اس چار پانچ ہاتھ کے طول وعرض میں تعجب
فی جوفہا جبلٌ اشم کبیر	ہے کہ اتنا اونچا بڑا پہاڑ کیسے سما گیا۔

کہتے ہیں کہ دفن کرنے والے جس وقت دفن کر رہے تھے، اسی وقت بے ساختہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کی زبان مبارک سے یہ شعر نکل پڑا، روتے جاتے تھے، اور کہتے جاتے تھے،

مٹی میں کیا سمجھ کے دباتے ہو دوستو
گنجینۂ علوم ہے، یہ گنج زر نہیں،

(اس کے بعد یہ گنجینۂ علوم (شیخ الہند) بھی اسی جگہ دفن ہو کر اپنے اصلی معدن سے جا ملا۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ محمد طیب غفرلہٗ)

اس وقت تو علوم کا ایک ہی گنجینہ یہاں دفن کیا گیا تھا، لیکن اب خدا ہی جانتا ہے کہ علم واخلاص، ایمان وعرفان کے کتنے خزانے اب تک اسی سرزمین میں محفوظ ہو چکے ہیں۔ اور کتنے پردیسی، غریب الوطن، ابناء السبیل کو رحمت کے اس جوار میں پہنچ کر آسودگی میسر آ چکی ہے[1]۔ ولنعم ما قیل ؎

[1] ارواح طیبہ میں نقل کیا ہے کہ کسی نے سیدنا الامام الکبیر سے ایک دفعہ پوچھا کہ بزرگوں کے قریب دفن ہونے کا کیا فائدہ، کہ ہر شخص کو اپنی ہی نیکی کام آتی ہے، پوچھنے والے صاحب اس وقت حضرت کو پنکھا بھی جھل رہے تھے۔ فرمایا کہ تم اس مجمع میں پنکھا کسے جھل رہے ہو، کہا کہ آپ کو، پنکھا کا فی بڑا تھا، دوسروں کو بھی ہوا پہنچ رہی تھی، اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ یوں ہی حق تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کے جھونکے جب چلتے ہیں، تو مقصود کوئی ہو، لیکن آس پاس والے بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ (تلخیص از ارواح ثلاثہ صہ ۱۸۱) مشہور حدیث ھم القوم الذین لا یشقی جلیسھم (اہل اللہ وہ لوگ ہیں جن کا ہم نشین کبھی نامراد نہیں ہوتا) حکیم الامت تھانوی نے اس روایت کو تائیداً پیش کرتے ہوئے سخاوی کی مقاصد حسنہ کی اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے جس میں حکم دیا گیا ہے کہ "اپنے مُردوں کو نیک صالح لوگوں کے درمیان دفن کیا کرو"۔ مگر اس روایت کا ایک راوی سلیمان بن موسیٰ مجروح اور ناقابل اعتبار ہے۔ کچھ بھی ہو ہندوستان میں تو گورِ غریباں کا اطلاق (باقی اگلے صفحہ پر)

نینداس کی ہے، دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں

جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

کون جانتا ہے کہ باطنی فیض رسانی کا یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

کچھ بھی ہو سیدنا الامام الکبیر بظاہر اب ہم میں نہیں ہیں، لیکن کہنے والے نے کہا تھا،

لعمرك ما واری التراب فعاله

لکنها واری ثیابا و اعظما

آج ہند ہی نہیں، بیرون ہند کی کتنی اسلامی آبادیاں آپ ہی کی جلیل دینی وعلمی خدمات کی روشنیوں سے جگمگا رہی ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ سمجھنے والوں کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، لیکن اللہ کی راہ میں قتل کے بعطاری ہونے والی موت سے مرنے والوں کو قرآن کی نص قطعی میں حکم دیا گیا ہے کہ نہ ان کو مردہ کہا جائے، اور نہ مردہ سمجھا جائے، بلکہ یقین دلایا گیا ہے کہ وہ احیار اور زندہ ہیں، تو جس کی ساری زندگی ہی اللہ ہی کی راہوں پر چلنے میں صرف ہوئی، جب تک زندہ رہا، اسی راہ پر چلتا رہا، اور وفات بھی اس کی جس وقت ہوئی، وہ اسی راہ پر رواں دواں تھا، ایسی صورت میں کیوں اصرار کیا جاتا ہے کہ اس کی "موت" کے بعد ہم اس کو مُردوں میں شمار کریں، یاد ہوگا کہ ایک دفعہ نہیں، متعدد مواقع پر مشاہدہ کرنے والوں نے وفات کے بعد دیکھا کہ

(گذشتہ صفحہ سے) ان مقبروں پر کیا جاتا ہے، جہاں آبادی کے پس ماندہ غریب لوگوں کے مرُدے دفن ہوا کرتے ہیں۔ لیکن عربی محاورے کی رو سے غریب مفلس کو نہیں، بلکہ اجنبی مسافر کو کہتے ہیں مشہور حدیث بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا فطوبیٰ للغرباء کا مطلب بھی یہی ہے کہ شروع میں بھی اسلام اور اسلامی زندگی سے لوگ ناآشنا تھے، بعد کو بھی ناآشنا ہو جائیں گے، مبارک وہی لوگ ہیں جو ناآشنائی کے ان دنوں میں اسلامی زندگی کی وجہ سے سوسائٹی میں اجنبی بن گئے ہیں۔ اس لحاظ سے سیدنا الامام الکبیر کی وصیت کے مطابق صحیح معنوں میں "گور غریباں" کا مصداق دیوبند کا یہ گور غریباں ہی ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ اتنے پردیسی مسافر خدا جانے کس کس ملک اور علاقے کے یہاں اب تک دفن ہو چکے ہیں اور آئندہ ہوں گے۔ فطوبیٰ لهولاء الغرباء ۱۲

"مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جسد عنصری کے ساتھ میرے پاس تشریف لائے تھے" ۱۸۹ ارواح ثلاثہ

یہ مولانا رفیع الدین سابق مہتمم دار العلوم دیوبند کا بیان ہے۔ تفصیل اس واقعہ کی اپنے محل پر گذر چکی ہے، اسی طرح مدرسہ کے وظیفہ سے قانونی طور پر محروم رہ جانے والے طالب علم کا قصہ بھی سنا چکا ہوں۔ جن کے سامنے بھی کچھ اسی قسم کی صورت پیش آئی تھی۔ ان کے سوا بھی دوسرے ذرائع سے جو روایتیں مجھ تک پہنچی ہیں، ان کے ہوتے ہوئے، ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ ان منامات و مبشرات کا بھی ذکر کیا جائے، جو عموماً اس قسم کے بزرگوں کی وفات کے بعد مناسبت رکھنے والے نفوس کو دکھائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ کی بھی بعض چیزوں کا بعض مواقع میں ذکر کر بھی چکا ہوں۔ جن میں سب سے درد انگیز خواب حضرت والا کے صاحبزادے حافظ محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ اولیٰ کا تھا۔ جس میں منجملہ اور اجزار کے انہوں نے خواب ہی میں دیکھا کہ ہمارے مصنف امام مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ دکھایا گیا تھا کہ رنگ رنگ کے پھولوں سے بھرے ہوئے ایک پلنگ پر سیدنا الامام الکبیر آسمان سے ان کے گھر میں اتر آئے گھر کے لوگ سب جمع ہیں۔ سیدنا الامام الکبیر ان کو خطاب کر کے صبر کے مسئلہ پر تقریر فرما رہے ہیں، صبر کی اس تلقین پر دیکھا کہ آگے بڑھ کر مولانا محمد یعقوب صاحب حضرت والا سے عرض کر رہے ہیں کہ

> "حضرت ہم لوگوں نے بہت صبر کیا، مگر جس وقت عائشہ اور ہاشم نظر پڑتے ہیں، صبر نہیں ہو سکتا۔"

عائشہ حضرت والا کی سب سے چھوٹی صاحبزادی کا نام ہے[1]، وفات کے وقت ان کی عمر کل چار سال کی تھی، اور ہاشم آپ کے چھوٹے صاحبزادے کا نام تھا۔ جن کی عمر اس وقت کل آٹھ سال کی تھی۔ کم عمری ہی میں بمقام مکہ معظمہ جن کا انتقال ہوا، خواب میں دیکھا گیا کہ حضرت

[1] [illegible] میں انتقال ہوا۔

مراثی و قصائد تعزیت

اس سلسلہ میں کاغذات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کے مرثیے بیشمار لکھے گئے، جن کا تذکرہ تو ملتا ہے مگر یہ قصائد نہیں ملتے۔ ناچار صرف وہ قصائد درج کئے جاتے ہیں جو مطبوعہ یا مخطوطہ دستیاب ہوئے۔ ان میں اردو کی قصائد میں حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اور حضرت اقدس شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قصائد اور فارسی میں حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند (حفید رشید حضرت نانوتوی قدس سرہٗ)، کے قصائد، اور آخر میں عربی کا ایک مرثیہ از حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب رحمہ اللہ درج کیا جارہا ہے۔

قطعۂ تاریخ وفات

قبلۂ اربابِ دین کعبۂ اصحاب یقین حضرت مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ بانی و سرپرست مدرسہ اسلامیہ دیوبند کہ بتاریخ ۴ جمادی الاولیٰ یوم پنجشنبہ وقت صلوٰۃ ظہر ۱۲۹۷؁ھ کو دار آخرت کی طرف رحلت فرمائی۔

(از نتائج طبع مولوی فضل الرحمٰن صاحب منبر ملّاؔ)

وہ غم ہے قاسمِ بزمِ ہدا کی رحلت کا — کہ جرعہ نوشِ الم جس سے ہر درونہ ہے

یہ ایسا غم ہے کہ جس غم سے بزمِ عرفاں کا — مثالِ خمِ فلک جام واژگونہ ہے

کچھ اک زمیں ہی نہیں زرد رنگ اس غم سے — لباسِ چرخ بھی ماتم میں نیلگونہ ہے

ہے حامیانِ شریعت کو گر غم بے حد — تو سالکانِ طریقت کو اُس سے دونہ ہے

کہاں ہے مدرسۂ دیں کا حامی برحق — کہ ملکِ علم و عمل اُس بغیر سونہ ہے

نہ پوچھ حالِ دلِ زارِ تشنگانِ علوم — کہ ان کی زیست ترے ہجر میں چگونہ ہے

کیا ہے شعلۂ ہجراں نے گر جگر کو کباب — تو آتشِ غم فرقت نے دل کو بھونا ہے

مگر مزارِ مقدس سے تیرے اے خوش خو — ترے فدائیوں کو صبر ایک گونہ ہے

سرِ الم سے لکھی فضلؔ نے سنین وفات

وفات سرورِ عالم کا یہ نمونہ ہے

۱۲۹۷ھ

مرثیہ حضرتِ نانوتوی مشتمل بر کیفیتِ اجراءِ دار العلوم دیوبند

جس کو حضرت مولانا شیخ الہند مرحوم نے جلسہ منعقدہ ۲۰ صفر المظفر ۲۴ھ میں سنا کر حضارِ مجلس کو مضطرب و بے قرار بنا دیا تھا۔

ہیں محن اور منن دونوں جہاں میں توام
حکمتِ حق کا ہے دونوں میں نرالا عالم

رحمت و فضل خدا جب ہے غضب پر سابق
کیوں نہ پھر قہر کو اس کے کہیں لطف و کرم

اس کی آغوش غضب میں ہیں ہزاروں رحمت
اُسکے ہر لطف میں ہیں سیکڑوں الطاف و کرم

فضل سے اس کے کسی وقت نہ ہو نا مایوس
خواہ پیش آئے مسرت تجھے اور خواہ الم

رحمت حق کی ہے تمہید سمجھ او ناداں
پیش دنیا میں جو کچھ آتا ہے اندوہ و الم

انقلاباتِ جہاں واعظِ رب ہیں سُن
ہر تغیر سے صدا آتی ہے فافہم فافہم

للہ الحمد میری جان اور انّا للہ
مرغِ ایمان کی ہیں بازو میں دو مستحکم

دور اندیش وہی ہے کہ مصائب کے عوض
ہو کے خوش مرضیِ مولیٰ کی کرے بیع سَلَم

جزر و مد بحرِ حوادث کا بچشم حق بیں
طرۂ شاہد تقریر کا ہے پیچ و خم

گردشِ دہر دکھاتی ہے ہمیں آنکھوں سے
کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَان کا نقشہ ہر دم

کل کی ہے بات کہ تھی جہل کی گھن گھور گھٹا
جس طرف آنکھ اٹھاتے تھے محیطِ عالم

آب حیواں کی طرح علم ہوا تھا مخفی
ظلمت جہل سے مخلوق تھی اَعمیٰ و اَصَم

رحمتِ حق ہوئی حامی تو یکایک اٹھے
چند مردانِ خدا باندھ کے صف ٹھوک کے خم

یوسفِ علمِ شریعت کے خریدار بنے
جمع کر کے سرِ اخلاص سے معدود درم

سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنام ایزد
گوردہ میں کہ جہاں بیٹھے ہیں اربابِ ہمم

شوق کہتا تھا بڑھو ضعف کہے تھا ٹھیرو
ناتوانوں کا تھا کیا کہیے عجب ضیق میں دم

اتنے میں دیکھتے بس کیا ہیں کہ اک مردِ خدا
آ رہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ عَلَم

بے نیازی و توکل رخِ روشن سے نمود — قطع منزل کے لئے دونوں قدم تیغ دو دم

کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کی فی الفور — پڑ گئی جان میں جان آ ہی گیا دم میں دم

ناتوانوں کو بلا اس کی حمایت سے نہ ڈر — زینۂ بامِ ترقی پہ بڑھا سب کا قدم

تھی نرالی ہی کچھ اس مردِ صفا کی سج دھج — تھے عجائب کچھ اس شیرِ خدا کے دم خم

گاڑ کر اس نے علم ایک ندا کی ایسی — یک بیک چونک پڑے اہلِ مدد اہلِ خیم

اس کی آواز تھی یا بانگِ خلیل اللّٰہی — کہہ کے لبیک چلے اہلِ عرب اہلِ عجم

عقل و انصاف کا جس سر میں ذرا بھی تھا اثر — ذوقِ علمی کا تھا جس سینہ میں تھوڑا سا بھی دم

دین کا ذرہ بھی تھا قلب میں جس کے مُودَع — خیر کا شمہ بھی تھا جس کے مقدر میں رقم

باندھ کر چست کمر کہتے ہوئے نحنُ معک — جس جگہ اُس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم

اس مربی دل و جاں کی مسیحائی سے — علمِ دیں زندہ ہوا جہل نے لی راہ عدم

ابرِ علم و عمل و فضل کا بادل برسا — جس جگہ اس یمِ رحمت کا پڑا نقشِ قدم

جہل کے جب سبھی کہنے لگے اِحسَا اِحسَا — چلدیا پاؤں دبے چپکے سے بابختِ وذم

علم کو لا کے ثریا سے ثریٰ پر رکھا — آنکھوں سے دیکھ لیا عَلَّمَ مَا لَمْ یَعْلَمْ

دولتِ علم سے سیراب کیا عالم کو — قاسمِ علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اس کا علَم

اس کی آواز تھی بیشک قُم عیسیٰ کی صدا — جس کے صدقہ سے لیا علم نے دوبارہ جنم

طائرِ علمِ شریعت کے لئے یہ دیبن — برکتِ حضرتِ قاسم سے ہے مامون حرم

سلسلے علم کے امصار و قرے تک جاری — اس کی ہمت سے ہوئے بل بے تما فیضِ اعم

جملہ اعیان و اکابر تھے جلو میں اس کی — اس کی شوکت کو پہنچتی تھی کہاں شوکتِ جم

یک بیک حکمتِ باری نے جو پلٹی کھائی — چلدئیے چھوڑ کے یہاں سب کو سوئے باغِ ارم

لوٹتے آگ پہ تھے حضرتِ یعقوب و رفیع — خوں آنکھوں سے بہاتے تھے رشیدِ عالم

دیکھ کر حضرت امداد کی زاری کو ملک — پر سمیٹے ہوئے کہتے تھے الٰہی ارحم

قاسم کر ترکہ قاسم کی محبت واللہ　　بے طرح اس دل اقدس میں ہوئی مستحکم

سب کی الفت پہ تھی اسکی ہی محبت غالب　　سب غموں پر جو تھا ممتاز یہی تھا وہ غم

پھر تو کیا تھا دی خدا نے وہ ترقی اسکو　　دیکھ لیں آپ کہیں اپنی زباں سے کیا ہم

پوچھتے کیا ہو دماغوں کا ہمارے احوال　　ہم غریبوں کا زمیں پر نہیں پڑتا تھا قدم

نہ مڑکا پر نہ رکا پر نہ مڑکا پر نہ رکا　　اس کا جو حکم تھا تھا سیف قضائے مبرم

نہ چلا کوئی فساد ایسا کہ پاؤں نہ کٹے　　فتنہ نے سر نہ اٹھایا کہ ہوا ہو نہ قلم

کلفتیں جھیلیں سبھی پر نہ ہوا چیں بجبیں　　دقتیں دیکھیں ٹلا اپنی جگہ سے نہ قدم

دشمن و دوست کے چہرے سے ہیں تفاوت کے عیاں　　سرسوں پھولی تھی وہاں اسنے ملا تھا عندم

سب مریضوں کے لئے ایک وہی تھا آنار　　سیکڑوں زہر تھے تریاق تھا بس اسکا دم

قاسم و حضرتِ امداد کو مرنے نہ دیا　　بلکہ زندہ ہی رکھا سب کو علی وجہ اُتم

مُردوں کو زندہ کیا زندوں کو مرنے نہ دیا　　اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابن مریم

ہائے غم ہائے ستم ہائے غضب ہائے الم　　آج اُس سے بھی ہوا دیکھ لو خالی عالم

آگے کہنے کی ہے کچھ بات نہ سننے کی تاب　　لب تلک آتا ہے لیکن یہ مقولہ پیہم

رحم بر بیکسیم ہیچ بکردی رفتی　　ایکہ کفش کف پائے تو بود تاج سرم

آج تو قاسم و امداد سبھی مرتے ہیں　　اس کا کیا ذکر ہے برباد ہوئے تم یا ہم

منتظر بیٹھے ہیں اب ہم پہ گذرتا کیا ہے　　قہر کا خوف ہے پر ساتھ ہے امید کرم

تو رحیم و ملک دبار ہے سَلِّمْ سَلِّمْ　　ہم جہول اور زیاں کار ہیں اِرْحَمْ اِرْحَمْ

اے اسیرانِ غمِ قاسمِ خیر و برکات　　دے فقیران سیر کوئی رشید جانم

پیروی کرتے رہو سبھی کو ہاتھوں سے نہ دو　　بھے یا درے یا قدمے یا بالقلم

بے نمک ہیں مرے اشعار مگر تلخ نہیں،

خالی از درد نہیں گرچہ ہیں لشٹم پشٹم،

از افادات

حضرت رأس المحدثین مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی قدس سرہ

در تاریخ وفات

بحر العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ہر چشم مثلِ ابر ہے کیوں اشکبار حیف ۔۔۔ ہر سینہ مثلِ لالہ ہے کیوں داغدار حیف

کس کی لگی ہے یہ نظرِ بد جہان کو ۔۔۔ دم میں ہوئی خزاں سے مبدل بہار حیف

ہے کیا سبب جہاں میں آتا نہیں نظر ۔۔۔ جز آہِ دردناک و دمِ شعلہ بار حیف

ہر ایک کی زباں پہ ہے جاری دعائے مرگ ۔۔۔ آتا نظر ہے ہر کوئی زار و نزار حیف

زیب جبیں ماہ مبیں کیوں ہے داغدار ۔۔۔ زخمی جگر ہے کیوں گہر آبدار حیف

مسکن پذیر دل میں ہے کیوں یاس و اضطراب ۔۔۔ صبر و سکوں سے آتی ہے کیوں ہم کو عار حیف

آنکھوں میں جوشِ اشک ہے سینہ میں درد ہے ۔۔۔ دل میں غم و الم ہے زباں پر ہزار حیف

مونس الم رفیق فغاں غمگسارِ غم ۔۔۔ ہمدرد درد ہمنفس اف یارِ غار حیف

سر ٹکڑے ٹکڑے سینہ ہوا چاک چاک اُف ۔۔۔ دل پارہ پارہ جامہ ہوا تار تار حیف

یہ زندگی ہے یا کوئی طوفان مرگ ہے ۔۔۔ غم جی میں اشک آنکھ میں دل میں غبار حیف

کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیا نشاط و عیش ۔۔۔ وردِ زبان اب تو ہے لیل و نہار حیف

دشنہ کا کیوں گلو کو ہے اس درجہ اشتیاق ۔۔۔ خنجر پہ غش ہے کیوں جگرِ بے قرار حیف

جینے پہ جان دیتے تھے ہم کل کی بات ہے ۔۔۔ زہر آبِ مرگ آج ہے کیوں خوشگوار حیف

کل تک تو آرزو تھی ہمیں عمرِ خضر کی ۔۔۔ ہر دم اجل کا آج ہے کیوں انتظار حیف

رشکِ خزان بہار ہوئی دشمنِ نشاط — محسود مرگ زیست ہوئی غمگسار حیف
یہ کون اٹھ گیا ہے کہ جی بیٹھا جائے ہے — یہ کون چھپ گیا کہ ہے حشر آشکار حیف
خورشید علم آج ہوا کون سا غروب — عالم تمام کیوں نظر آتا ہے تار حیف
کس خاکسار کل ہے یہ ماتم کہ جائے اشک — برسے ہے چشم دہر سے پیہم غبار حیف
کس ضابط و صبور کا شیون ہے یہ کہ آہ — سینہ سے لب تک آتی نہیں زینہار حیف
جو باعثِ نشاطِ دلِ ناصبور تھا — روتے ہیں اس کی ہجر میں اب ابرنار حیف
ہر بات جس کی مایۂ صبر و شکیب تھی — عالم ہے اس کے ہجر میں اب بیقرار حیف
جب باعث حیات ہی ہو موجب ممات — اللہ کیا کرے دلِ امیدوار حیف
وہ آج بار دوش احبا ہے حسرتا — جو ڈالتا کسی پہ نہ تھا اپنا بار حیف
عالم میں جس کا مثل عدیم الوجود تھا — لو اٹھ گیا جہان سے وہ کوہ وقار حیف
محروم زیست قاسم بزمِ ہدے دریغ — آغوش گور عارف شب زندہ دار حیف
تقریر دلپذیر ہو جس کی غذائے روح — وہ لقمۂ اجل ستم روزگار حیف
عیسیٰ دم اور صرصر مرگ اے فلک دریغ — گنج علوم وہبی و کنج مزار حیف
موسائے وقت و سحر اجل وا مصیبتا — خضر زمان و گوشہ نشین حصار حیف
یوسف لقا و چاہ لحد ہمدم الحذر — دیو قضا و آصف دوران شکار حیف
زیر زمین طائر عرش آشیانہ اف — بالائے چرخ زیب وہ روزگار حیف
باد خزان و گلشن دین اے زمانہ آہ — برق فنا و خرمن صبر و قرار حیف
کشاف علم دین ہو اور پردۂ عدم — موج قضا ہو کشتی عالم سے چار حیف
جان جہاں ہو رہن عدم وائے بیکسی — پامال خاک رہ ہو درشاہوار حیف
آیا قرار آپ کو بس جاکے زیر خاک — اللہ رے غضب ہوس انکسار حیف
گردن پہ تیرے خون ہے سارے جہان کا — تیرا بھلا نہ ہو ہوس انکسار حیف

مرثیہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ بزبان عربی

از حضرت مولٰنا ذوالفقار علی صاحب دیوبندی

یا قاسم الخیر من للعلم والدین	اذا ارتحلت وارشاد و تلقین

(ترجمہ) اے قاسم الخیر جب آپ رحلت کر گئے، تو علم دین اور ارشاد و تلقین کا کون کفیل ہوگا۔

یا قاسم الخیر من للطارقین ومن	للضارعین مکروب ومحزون

(ترجمہ) اے قاسم الخیر اب مہمانوں، بے وسیلہ سائلوں غم زدوں اور بے چینوں کا کون کفیل ہوگا۔

یا قاسم الخیر اسمع من لکربتنا	یا قاصم الضیر قل من للمساکین

(ترجمہ) اے قاسم الخیر سن تو سہی! اے نقصان کی تلافی کرنے والے تو ہی کہہ مسکینوں کا کفیل اب کون ہے گا

من للمدارس من للوعظ من لهدی	من للنکات توضیح وتبیین

(ترجمہ) مدارس، وعظ و ہدایت، نکتہ سنجی اور توضیح و تشریح مطالب (یعنی دقیقہ سنجیوں) کا کون کفیل ہوگا۔

من للشریعة او من للطریقة او	من للحقیقة اذا رسیت فی الطین

(ترجمہ) شریعت، طریقت اور حقیقت کا محافظ کون ہوگا جبکہ تو زیر زمین مقیم ہوگیا۔

رحلت عنا ولم یوجد عدیلک فی	العلوم والفضل من عرب الی الصین

(ترجمہ) تو ایسے حال میں ہم سے جدا ہو کر عازم سفر ہوا جبکہ علم و فضل میں عرب سے چین تک تیرا کوئی ہمسر موجود نہیں۔

یا عین جودی بدمع غیر منقطع	علی الذی جل من مدح وتابین

(ترجمہ) اے میری آنکھ مسلسل آنسو بہاتی رہ ایسی ذات کے لئے جو لوگوں کی قصیدہ گوئی اور مرثیہ خوانی سے بالاتر ہے۔

نجم الهدایة رجم للشیاطین		کهف الوری حجة الاسلام مرشده

(ترجمہ) (وہ جو) مخلوق کے لئے پناہ گاہ، اسلام کی حجت اور اس کا رہنما، ہدایت کا ستارہ اور شیاطین کے لئے شہاب ثاقب تھا۔

مبارک الاسم والزیتون والتین		بحر العلوم امام الکون اکرمه

(ترجمہ) تین اور زیتون کی قسم وہ علوم کے بحر بیکراں، کائنات کے امام، ان میں سب سے زیادہ معزز اور بابرکت نام والے تھے۔

برئت من ذکر اسلاء وتسکین		لقد مضی صاحبی من فی مصیبته

(ترجمہ) واللہ میرا وہ ساتھی گذر گیا جس کی مفارقت کی مصیبت میں میں تسلی وتشفی کے مرحلہ ہی سے آگے نکل چکا ہوں (کہ اب مجھے کوئی تسلی دے اور میں تسلی پا جاؤں)

من لی بقلب بصبر غیر مقرون		من لی بصدر عن الاحزان منقطع

(ترجمہ) (ا) وہ سینہ کہاں سے لاؤں جو غم واندوہ سے خالی ہو، وہ قلب کہاں سے لاؤں جو صبر سے خالی ہو۔

(ب) کوئی ہے جو میرے لئے ایسے سینہ کا ضامن ہو، جو دوسرے تمام غموں سے خالی ہو۔ کوئی ہے جو میرے لئے دل بیقرار کا ضامن ہو۔

عن الخلیل الا یاسلوتی بینی		الیک صبری فشئ لیس یشغلنی

(ترجمہ) اے میرے صبر مجھ سے دور رہ اور اے تغافل میرے پاس سے ہٹ جا۔ (اس لئے کہ کوئی شے مجھ کو اس دوست کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی۔

یکون للشمس من ستر وتدفین		وکیفما ستروه فی التراب ولا

(ترجمہ) حیرت ہے کہ لوگ اس ذات کو مٹی میں کس طرح چھپا سکے حالانکہ "خورشید" کو نہ تو چھپایا جا سکتا ہے اور نہ اسے دفن کیا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ

سرسید مرحوم کی نظر میں

رسالہ دارالعلوم بابت ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ مضمون سید محبوب رضوی صاحب

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کی وفات پر سرسید مرحوم نے "علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ" کی اشاعت مورخہ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں حضرت نانوتوی رح کے متعلق سرسید رح نے اپنے تاثرات کا جن الفاظ میں اظہار کیا ہے وہ الفاظ معاصرانہ چشمک سے مبرا ہونے کے علاوہ حضرت نانوتوی رح کے علم وعمل اور صلاح وتقویٰ کا جو مقام متعین کرتے ہیں، اسکے متعلق یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ وہ عقیدتمندانہ جذبات کے غلو سے قطعاً پاک ہیں۔

کسی ایسے شخص کا اپنے کسی ایسے معاصر کے بارے میں اظہار رائے کرنا جو اس شخص کے عقائد و افکار اور رجحانات سے شدید اختلاف رکھتا ہو ظاہر ہے کہ کس بے لاگ حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے، یہ حضرات ایک دوسرے کو ذاتی حیثیت سے کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ تصفیۃ العقائد کی اس مراسلت سے ہو سکتا ہے جو ان حضرات کے مابین ہوئی ہے، اس مراسلت میں سرسید اپنے ایک دوست (منشی محمد عارف صاحب) کو خط میں لکھتے ہیں

"اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری سعادت ہے، میں اُن کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔"[1]

مستذکرہ بالا مکتوب کے جواب میں سرسید کے ان ہی دوست کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا کہ:۔

"ہاں اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب (سرسید) کی اولوالعزمی اور دردمندئ

[1] تصفیۃ العقائد صفحہ ۳ مکتوب سرسید بنام منشی محمد عارف۔